اسلام ہی کیوں؟

پیام اعظمی

هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ۝

"اسلام ہی کیوں"

پیام اعظمی

امیہ دارالاشاعت، انباری، اعظم گڑھ (یوپی)

ہندوستان

پن کوڈ:- ۲۲۳۲۲۲

فون نمبر:- ۹۱-۵۴۶۰-۴۰۵۹۱

اِمامیہ دارالاشاعت کی قابلِ فخر پیشکش

نئی نسل کیلئے

عصری زبان، سائنٹیفک اسلوب، ریاضیاتی استدلال

کیساتھ

اسلامی حقائق و معارف کی تفہیم

بسمہ سبحانہٗ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب :- ________ اسلام ہی کیوں؟

مصنّف :- ________ پیام اعظمی

تعداد اشاعت :- ________ ایک ہزار ۱۰۰۰

صفحات :- ________ تین سو تین ۳۰۳

کتابت :- ________ حافظ طاہر حسین و ابوالوفا

سالِ اشاعت :- ________ ستمبر ۲۰۰۱ء

مطبوعہ :- ________ اے ۔ بی ۔ سی پریس دہلی

قیمت :- ________ [illegible] روپئے

بیرونِ ملک ۲۵ ڈالر (امریکن)

ناشر :- امامیہ دارالاشاعت، انباری، اعظم گڈھ، یوپی، ہندوستان

ملنے کے پتے

- امامیہ دارالاشاعت، انباری ضلع اعظم گڈھ، یوپی، انڈیا
- تنظیم المکاتب جگت نرائن روڈ، گولہ گنج، لکھنؤ
- ایلیا میسج سینٹر، عباس نگر مفتی گنج، لکھنؤ
- انجمن روحِ ادب ۱۵/۵۱-اے بھدوئں، وارانسی
- جامعہ انوار العلوم، مرزا غالب روڈ، الہ آباد ۔ یو ۔ پی
- اسلامیہ پبلیکیشن سینٹر، پوسٹ باکس نمبر ۱۱۴۷ جی پی او سرینگر کشمیر

اِعتراف

زیرِ نظر کتاب کو مرحلۂ تصنیف سے منزلِ اشاعت تک پہونچانے کی تمام تر ذمّہ داری، ڈاکٹر سیّد آفتاب حسین، ایم۔ ڈی۔ نیو جرسی (امریکہ) نے ادا کی ہے اور اس کی تکمیل موصوف کے جذبۂ خیر کی رہینِ منّت ہے۔

اللہ ان کے بزرگوں کے درجات کو بلند فرمائے۔ ان کی اولاد کو جادۂ حق پر ثابت قدم رکھّے اور ان کی توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے۔

(ادارہ)

بنام

خدائے رحمٰن و رحیم

بحقِّ

محمدؐ و آلِ محمدؐ

بخدمتّ

حضرت ولی العصر

عجّلَ اللّٰہُ فَرَجَہٗ

مُندرجات

یا اللہ!

ایک گنہ گار قلم، اور ایک گنہ گار فکر، تیرے دین کی خدمت کے جذبے کے ساتھ محوِ سفر ہے۔ تیرے علاوہ نہ کوئی سہارا دے سکتا ہے نہ ہدایت کی روشنی۔

میرے مالک! مجھے نہیں معلوم کہ یہ کتاب مقبول ہو گی یا نامقبول۔؟ مجھے خبر نہیں کہ لوگ اسے پڑھ کے خوش ہونگے یا ناخوش۔؟ پتہ نہیں اسکے نتیجے میں جہالت کے کتنے سارٹیفکٹ ملیں گے۔؟ یا روایتی فکر کفر کے کتنے فتوے صادر کریگی ــــ مجھے دنیا کی تحسین و تکذیب کی فکر نہیں ــــ صرف تیری رضا درکار ہے۔

میرے مولا! میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ جب تیری بارگاہ میں حاضری کا وقت آئے تو کہہ سکوں کہ تو نے غور و فکر کا حکم دیا تھا ــ غور و فکر کے ذریعے دل و دماغ میں معرفت کے جو چراغ روشن ہوئے اور تیری کتاب نے ادراک کی جو قندیلیں جلائیں ہیں انھیں اپنے ساتھ قبر میں لیجانے کے بجائے تیری امانت سمجھ کے تیرے بندوں کے حوالے کر آیا ہوں۔

مالک! اگر یہ تحریریں بیکار اور عبث ہیں تو انھیں محو کر دے۔ اور اگر ذہنی انتشار کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کا ذریعہ بن سکتی ہیں تو انکی حفاظت فرما۔!

"تو جسے چاہے مٹادے۔ اور جسے چاہے باقی رکھے"۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ○
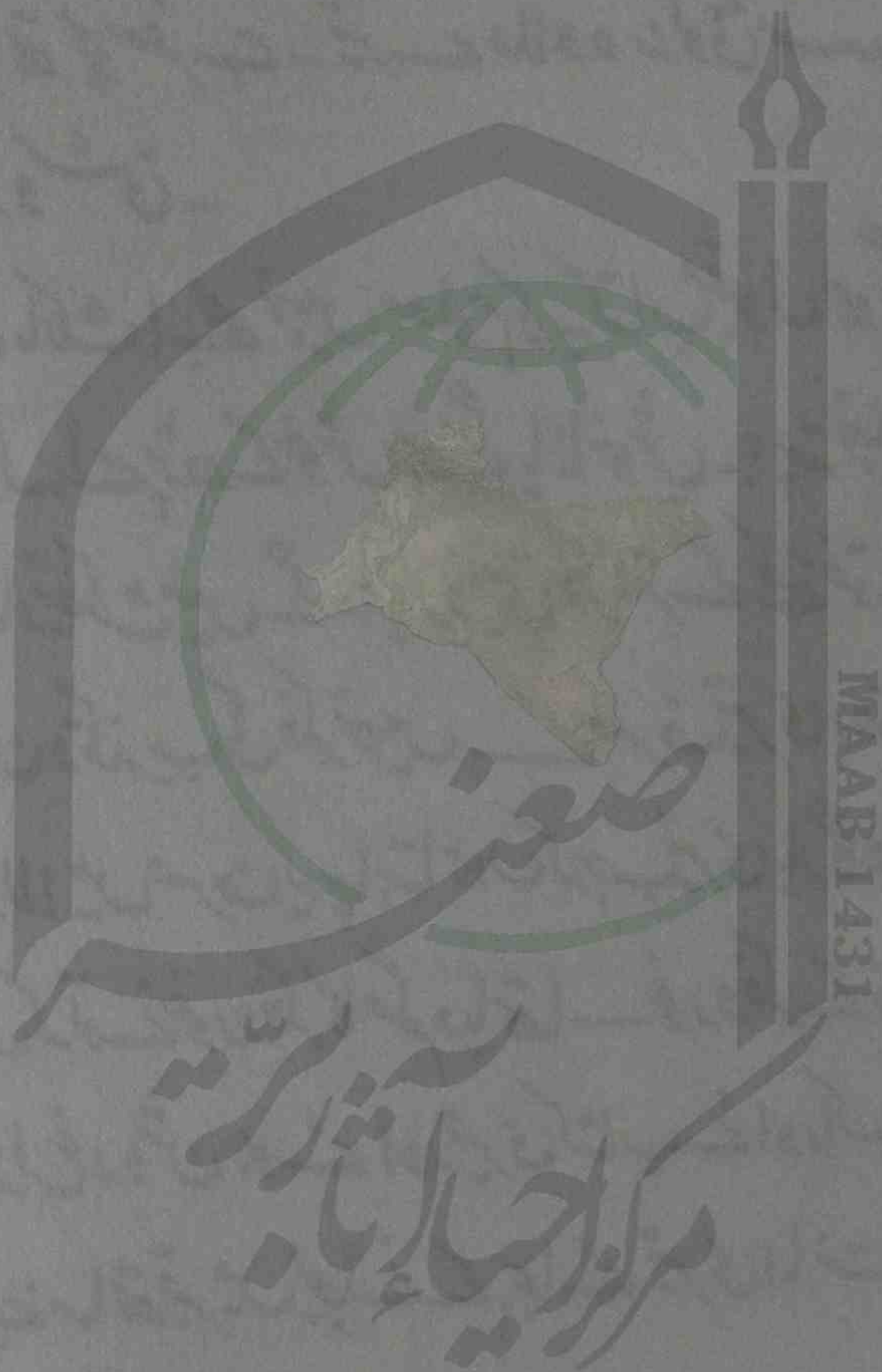
اپنی بات

تمام تعریف اور تمام شکر گذاری خدائے رحمٰن و رحیم کے لئے ہے۔ اس نے ہمیں اپنے دین کی خدمت کی توفیق مرحمت فرمائی۔ اور اس کتاب کو اشاعت کی منزلوں سے گذار کے منظرِ عام تک پہونچانے کی صلاحیت بخشی۔

اس قابلِ فخر پیشکش پر ہم اس کا جتنا بھی شکر کریں کم ہے۔ والدِ علام پیامِ اعظمی مدظلہٗ نے اس کتاب "اسلام ہی کیوں؟" کے ذریعہ لوگوں کو فلسفیانہ مباحث میں الجھائے بغیر عام فہم مثالوں سے عام فہم زبان میں دل کش اور سادہ انداز میں اسلامی حقائق و معارف کی ترسیل کی ذمہ داری ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ مالکِ حقیقی ان کی اس سعی کو مشکور فرمائے۔ اور بحقِ محمدؐ و آلِ محمد علیہم السلام اسے اپنے بندوں میں مقبول فرمائے اور ہمیں مزید توفیقِ خدمتِ دین عطا فرمائے۔ نشریات کے اس سلسلے کو باقی رکھے۔

امامیہ دارالاشاعت کا یہ دوسرا قدم نظم کے بعد نثر کی شکل میں "اسلام ہی کیوں؟" کے عنوان سے آپ کے سامنے ہے۔ یقین ہے۔ "تَعَاوَنُوا عَلَی الْبِرِّ وَالتَّقْوٰی" کی بنیاد پر کہ آپ کا تعاون ہمیں حاصل رہے گا۔ افاضل علماء اور اہلِ دانش پر مشتمل دارالاشاعت تصنیفات و تالیفات کے راستے پر

گامزن ہے۔ ابھی رفتار سست ہے۔ مگر آپ کا تعاون اور حوصلہ افزائی اس قافلے کو :

"تیز ترکِ گامزن منزلِ ما دور نیست"

تک پہونچا سکتی ہے ـــــ بوند بوند جمع کر کے گلاس بھرنے کا وقت نہیں رہ گیا ہے ـــــ تعاون کا ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ کسی ایک کتاب کی تصنیف و تالیف اور اشاعت پر آنے والے اخراجات کی ذمہ داری سنبھال لیں۔

- ہمیں اپنے قیمتی مشوروں سے آگاہ فرمائیں۔
- آپ جن موضوعات پر لکھا جانا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کی نشاندہی کریں۔ اہلِ قلم، علماءِ کرام و اربابِ دانش سے تعاون کی گذارش ہے۔ ہم ان کے لئے حوالے کی کتابوں کی فراہمی اور معقول حقِ خدمت کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں ـــــ والسلام

تقی مرتضیٰ رضوی

سکریٹری امامیہ دارالاشاعت

انباری، اعظم گڈھ

حجۃ الاسلام مولانا سید
تلمیذ الحسنین رضوی صاحب قبلہ
نیوجرسی امریکہ

تقریظ

انسان قدرت کا حسین شاہکار ہے، جسے منصۂ شہود پر لانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے خود کو احسن الخالقین کہا ہے۔

اسے عقل و شعور اور فکر و فہم کی نعمتوں سے نواز کر اس کے سر پر تکریم و تعظیم کا تاج رکھ دیا ہے۔

اسی انسان کے بارے میں مولائے کائناتؑ فرماتے ہیں۔

اَتَزعَمُ اَنَّکَ جِرمٌ صَغِیرٌ وَفِیکَ انطَوی العَالَمُ الاَکبَرُ

کیا تم نے خود کو ننھا منا سا جرثومہ سمجھ رکھا ہے۔ تمہارے وجود میں تو ایک بہت بڑی دنیا پوشیدہ ہے۔

عالی جناب محترم المقام ڈاکٹر پیام اعظمی صاحب جو شاعری کے اُفق پر آفتاب و ماہتاب بن کر چمک رہے ہیں اور اُن کی شاعری کے کئی مجموعے زیورِ طبع سے آراستہ و پیراستہ ہو کر قبولِ عام اور شہرتِ دوام کی سند حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن شاید کچھ لوگوں کو یہ پتا نہیں کہ اُن کا اشہب قلم اور توسنِ فکر نثر میں بھی جولانیاں دکھاتا ہے۔ اس کتاب سے قبل بھی اُن کی تحریریں مختلف جرائد اور رسائل میں شائع ہو کر مرکزِ توجہ اور موضوعِ بحث رہی ہیں۔

گرامی قدر ڈاکٹر پیام اعظمی صاحب نے دین شناسی کے موضوع پر

منفرد انداز سے قلم اٹھایا ہے اور تفکّر و تدبّر کی نئی راہیں، نئی سمتیں اور نئے زاویے فراہم کئے ہیں۔

ایک انسان دین کا متلاشی گھر سے باہر قدم نکالتا ہے اپنی معلومات کے سہارے اور عقل و خیر کی روشنی میں قدم آگے بڑھاتا ہے۔

یہ وسیع و عریض کائنات، زمین، آسمان، سورج، چاند، ستارے اور سیّارے ان کا مربوط اور حکیمانہ نظام — کسی صانع، خالق، مالک اور رب کا پتا بتاتے ہیں۔

سرسری تم جہان سے گذرے
ورنہ ہر جا جہانِ دیگر تھا

یہ انسان برق اور اس کی کرشمہ سازیاں سائنسی ایجادات اور اس کی برکتیں ملاحظہ کرتا ہے اور اس کے پیچھے کارفرما محرّک اور عوامل کو سمجھتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے وجود پر غور و خوض کرتے ہوئے خودشناسی سے خداشناسی کی سرحد میں داخل ہو جاتا ہے۔ وہ رفارمر، مصلحین اور فلسفیوں سے دستورِ حیات طلب کرتا ہے بلکہ ہر دروازے پر دستک دیتا ہے لیکن کسی منزل پر اسے تسلّی اور تشفّی نہیں ہوتی۔

فرجامِ کار وہ آئینِ حیات، دستورِ زندگی اور نظامِ بندگی کو قرآن کریم کی صورت میں پالیتا ہے اب اس کے سامنے علم و آگہی کے دریچے وا ہو جاتے ہیں اور کامیابی و کامرانی کی کلید اس کے ہاتھ لگ جاتی ہے۔

ڈاکٹر پیام اعظمی نے اس کتاب میں فلسفیانہ مباحث میں الجھائے بغیر اور فرسودہ دلائل و براہین سے قطع نظر کرتے ہوئے نہایت سلیس، عام فہم، دل کش اور دل چسپ انداز میں ایک سادہ لوح انسان کو دینِ مبین کے حقائق سے آشنا کر دیا اور اُسے اُس کے رب سے ملا دیا ہے۔

این کار از تو آید و مردان چنین کنند

پیش گفت

زیرِ نظر کتاب تقریباً بیس، پچیس سال کے غور و فکر کا نتیجہ ہے۔

یہ غالباً ۱۹۷۵ء کا زمانہ تھا کہ الہ آباد یونیورسٹی کے کچھ طلاب سے مذہب کے موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی کہ ایک نوجوان نے کہا! "ہمیں کیا حق ہے کہ اپنے مذہب کو صحیح اور دوسرے کے مذہب کو غلط کہیں؟ اس طرح تو ہر مذہب کے ماننے والے کو حق حاصل ہے کہ اپنے مذہب کو "حق" اور دوسرے کے مذہب کو باطل قرار دے ـــــ کسی شے کے بارے میں کوئی رائے دینے کا حق اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس کے بارے میں پوری طرح واقفیت حاصل ہو ـــــ اس وقت دنیا میں تقریباً سولہ سو مذاہب ہیں۔ انھیں غلط یا صحیح کہنے کا حق اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب ہم ان مذاہب کی فلاسفی، ان کے مراسم اور اس مذہب کی پیچیدہ نزاکتوں کا غیر جانبدارانہ اور تفصیلی مطالعہ کر لیں ـــــ یعنی ان مذاہب کے صحیح مفہوم تک پہونچنے کے لئے کم از کم سولہ سو سال کی زندگی درکار ہے۔ اور یہ ناممکن ہے۔

اس لئے کسی مذہب کو غلط کہنے کے بجائے سب کو صحیح مان لیا جائے۔

اور "وحدتِ ادیان" کے نظریئے کی تائید کی جائے۔

اس وقت تو حتی المقدور ان لڑکوں کو سمجھانے کی کوشش کی۔ اور مختلف

مثالوں کا سہارا لیا انھیں بتایا کہ دنیا میں سولہ سو نہیں صرف ایک مذہب ہے اور اس کا نام اسلام ہے۔ اور وہ بظاہر بات مان بھی گئے ــــ مگر ان کی گفتگو نے خود مجھے بے شمار سوالیہ نشانوں کے درمیان کھڑا کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ خود میرا مذہب بھی میرا اپنا ذاتی مذہب نہیں بلکہ میرے آباء و اجداد کا مذہب ہے جو مجھے بطور وراثت مل گیا ہے ــــ آدمی کا ذاتی مذہب وہی ہے جسے خود اس نے اپنی عقل و فہم کی روشنی میں ذاتی غور و فکر کے ذریعے حاصل کیا ہو جسے وہ پوری طرح جانتا بھی پہچانتا بھی ہو ــــ ورنہ وہ اپنے باپ دادا کا نقال اور اپنے سماج کی "صدائے بازگشت" ہوگا۔

بس یہی لمحہ تھا! جب میں نے طے کیا، کہ وہی مانوں گا جسے ماننے پر عقل مجبور کر دے گی۔ اور وہی کروں گا ــ جس کے کرنے کا حکم میرا منطقی شعور دے گا۔

میں مسلسل غور و فکر کرتا رہا اور یہ کتاب عالمِ وجود میں آتی گئی ــــ کئی سال پہلے اس کتاب کے ابتدائی حصے خبر نامہ تنظیم المکاتب میں قسط وار شائع ہو چکے ہیں۔ اس کی تصنیف میں علماءِ کرام اور اربابِ دانش کی حوصلہ افزائیوں کا سہارا بھی شامل تھا۔

ایک "انسان سادہ" اللہ کا ایک سادہ لوح بندہ، جو نہ فلسفۂ مذہب کا عالم نہ لغت ہائے حجازی کا "قارون" ــــ اپنی عقل کے سہارے اپنی زندگی کا معنوی سفر شروع کرتا ہے ــــ اس کی عقل اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے

خالق کے وجود کا اقرار کرے۔ وجودِ خالق کا یقین اسے بارگاہِ رسالت میں پہونچا دیتا ہے۔ رسالت کی روشنی اسے امامت کے دروازے پر کھڑا کر دیتی ہے ـــــ (اللہ کی توفیق کے سہارے اس سے آگے کے مرحلے اس کتاب کے دوسرے حصّے میں پیش کرنے کا ارادہ ہے۔ (انشاء اللہ۔)

مجھے یقین ہے کہ اسلام کو سمجھنے کے لئے یہ کائنات سب سے بڑی درسگاہ اور خود انسان کا وجدان سب سے بڑا معلّم ہے۔

حوزات وجامعات، پیچیدہ اصطلاحوں، اور بھاری بھر کم الفاظ اور روایتی طریقۂ تعلیم، اور مخصوص فنّی کتابوں کی ضرورت اور افادیت کا اعتراف کرنے کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان کے بغیر اسلام کو پوری طرح سمجھا بھی جا سکتا ہے اور سمجھایا بھی جا سکتا ہے۔

اسلام فطرت کی آواز ہے! اس لئے انسان اگر اسلام کو سمجھنا چاہتا ہے تو مذکورہ علوم کا "ہفت خواں" راستے کی دیوار نہیں بنتا ـــــ زاویۂ فکر اگر ٹیڑھا نہ ہو جائے تو ہر آدمی اندر سے مسلمان ہے۔

مگر افسوس کہ "ملّائیت" نے عام مسلمانوں کی اکثریت سے، غور و فکر اور عقل و فہم سے کام لینے کی صلاحیّت چھین لی۔ نتیجہ میں "اسلام" "فکر و عمل" کا ایک منطقی نظام بننے کے بجائے "روایات و رواسم" کا ایک مجموعہ بن کے رہ گیا ـــــ حالانکہ قرآن نے سب سے زیادہ جس بات کا حکم دیا

ہے وہ غور و فکر، اور عقل و فہم سے کام لینا ہے ۔ یہاں حوالے کی ضرورت اس لئے نہیں محسوس کرتا کہ شاید ہی قرآن کا کوئی ایسا صفحہ ہو جس میں غور و فکر کا حکم نہ موجود ہو ۔ وہ غور و فکر سے نہ کام لینے والوں کو "کیڑوں مکوڑوں سے بدتر سمجھتا ہے ۔

اس وقت اسلام کو رزم گاہِ حیات سے الگ کر دیا گیا ہے ۔ صرف رسموں سے رسموں کا مقابلہ ہو رہا ہے ۔ تاریخ کی مجبوریوں نے ایک ایسا مذہبی نظام پیدا کر دیا ہے جس میں کچھ تھوڑے سے علماء، باقی سب عوام النّاس پیدا ہوتے ہیں ۔ اس نظام کا ایک سرا قرآن سے ضرور جڑا ہوا ہے مگر باقی سب کچھ برہمنزم سے متاثر ہے ۔ مجھے یقین ہے کہ اگر اسلامی معاشرہ قائم رہتا تو اس نظام کی کوئی ضرورت نہ پڑتی مگر عالمِ اضطرار میں یہی "نظام" امت کا سہارا ہے ۔ چونکہ فی الحال اس کا کوئی متبادل نہیں لہٰذا اس نظام کی حفاظت اور احترام ہمارا فریضہ ہونا چاہیئے ۔

مجھے بہت کم ایسے لوگ ملے جو لاَ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کے قائل نہ ہوں، مگر افسوس کہ ہم سب مل کے بھی انسانیت کو مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہ تک نہ پہونچا سکے ۔

زیرِ نظر کتاب میں بہت سے ضروری مباحث نہیں شامل ہیں جس پر انشاء اللہ آئندہ گفتگو ہوگی ۔

(نوٹ:- اس کی تفصیل دوسرے حصے میں ملاحظہ فرمائیں)

آنے والی نسلیں سائنس اور ٹکنالوجی کے عہد کی نسلیں ہیں ۔ مذہب

کو سمجھائے بغیر، مذہب ان سے منوایا نہیں جا سکے گا۔ وہ زمانہ گذر چکا ہے جب اندھی عقیدت کے غلاف میں لپٹا ہوا مذہب ایک نسل سے دوسری نسل کو ورثے میں ملتا تھا۔ اور لوگ اس غلاف کو ہاتھ لگاتے ہوئے بھی ڈرتے تھے۔

آنے والی نسلوں کو توہمات کے راستے مذہب کے دروازے تک نہیں پہونچایا جا سکتا ــــ گھر کے اندر کا ماحول باہر کی فضاؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتا ــــ ذرائع ابلاغ نے دنیا کو سمیٹ کے چھوٹا کر دیا ہے۔ دنیا بھر کی تہذیبیں، ثقافتیں بلکہ خیالات و نظریات مخلوط ہوتے جا رہے ہیں۔ انٹرنٹ کے اس عہد میں ایک قوم کو دوسری قوم سے الگ نہیں رکھا جا سکتا اور اب نہ یہ ممکن ہے کہ جدید فکر کو صرف "ہے" کہکے مطمئن کر دیا جائے ــــ کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اور کیسے ہے؟ کے جواب دینے ہی پڑیں گے ــــ اور جواب دینے کے لئے عصری اسلوب اور سائنٹفک ذریعۂ اظہار ناگزیر ہے۔

اس وقت قوم کے سامنے گوناگوں مسائل ہیں، متعدد ادارے انھیں حل کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے ہیں۔

ہمارے نزدیک سب سے بڑا مسئلہ دینی شعور کی کمی اور اسلامی حقائق و معارف سے ناواقفیت ہے۔ اور اس کے حصول کا ذریعہ، مذہبی لٹریچر ہے۔

اس وقت ہماری قوم خطابت میں سب سے آگے ہے مگر لٹریچر میں سب سے پیچھے ہے۔ مثل مشہور ہے کہ قومیں اپنے لٹریچر سے پہچانی جاتی ہیں ــــ دوسروں کے اسٹال پر ہر صبح کوئی نہ کوئی نئی کتاب آجاتی ہے ــــ ہمارے

یہاں روز نئے خطیب تو ضرور پیدا ہو رہے ہیں مگر قلم کی دنیا میں سناٹا بڑھتا جا رہا ہے ــــ آج ہماری قوم کی مذہبی معلومات صرف تقریریں ہیں ــــ اور وہ بھی ان کی تقریریں جو خود تقریریں سُن کے مقرّر بن گئے ہیں۔

کیسا مقامِ عبرت ہے کہ آج اگر کوئی ہم سے کہے کہ ہمیں اردو میں لکھی جانے والی کسی ایسی کتاب کا نام بتایئے جسے پڑھ کے ہم حضرت علیؑ کے کارناموں اور اس کی معنویت کو سمجھ لیں ــــ تو ہم صبح سے شام تک یہی سوچتے رہ جائیں گے کہ کس کتاب کا نام لیا جائے۔؟

الغرض معیاری اور منطقی لٹریچر کی فراہمی آج سب سے بڑی ضرورت ہے۔ جس کے لئے افاضل کو تیار کرنا پڑے گا۔ نوجوانوں میں تصنیف و تالیف کا ذوق پیدا کرنا ہوگا۔ علماء و افاضل کو قلم اٹھانے پر مائل کرنا ہوگا، اور ان کی مادّی ضرورتوں کو پورا کرنے کی ذمّہ داری سنبھالنا پڑیگی۔ اس لئے کہ ضرورتوں کی دھوپ قلم کی روشنائی خشک کر دیتی ہے۔

قرآن سے وابستہ صالح اور صحتمند لٹریچر کی ضرورت عہد حاضر میں کچھ اور بڑھ گئی ہے۔ کیونکہ ہمارے مخالف مکاتبِ فکر کے "قلم" ہر وقت گردش میں ہیں ــــ اور دوسری مصیبت ایک اور سامنے آگئی ہے وہ یہ کہ قوم کے اقتصادی حالات نے اشاعت کے راستے آسان کر دیئے ہیں نتیجے میں مصنّف بن جانے کا شوق بڑھ گیا ہے۔ لوگ مجلسوں میں جو کچھ سنتے ہیں یا اپنے طور پر اپنی ناقص بنیاد پر جو فیصلے کرتے ہیں انھیں شائع کر دینا ضروری سمجھتے

ہیں ـــــ ایسی کتابیں عالمِ وجود میں آرہی ہیں جو ہمارے مذہب کے بارے میں لوگوں کو غلط فہمی کا شکار بنا سکتی ہیں اور مکتبہ اہلبیتؑ کی امیج (Image) کو مجروح کرسکتی ہیں۔ "دھاچوکڑی" تحریروں کی دنیا میں خدانا خواستہ پیدا ہوسکتی ہے جو ہمارا "ذوقِ خطابت" پیدا کرچکا ہے۔

اندھیروں سے مقابلہ کا صحیح طریقہ چراغ جلانا ہے ان سے ٹکرانا نہیں۔

ـــــ دوسرے ملکوں میں لکھی جانے والی کتابیں، وہاں کے مخصوص تہذیبی پس منظر میں لکھی جاتی ہیں ـــــ ان کے ترجموں کی بیساکھی پر برِ صغیر کے شیعہ اپنا قد نہیں بلند کرسکتے۔

برادرانِ اسلام کے درمیان "دارالمصنفین" جیسے متعدد ادارے ہیں جہاں ان کے اربابِ قلم کا پورا پورا حلقہ ہمہ وقت مصروفِ عمل ہے ـــــ مگر ہمارے یہاں سناٹا ہے۔!

بس یہی صورتِ حال پیشِ نظر تھی کہ ہم نے، سچے اور اچھے مذہبی ادب کی تخلیق کو پوری قوم کے لئے واجب کفائی سمجھا اور اپنے کمزور قدم اس سنگلاخ وادی میں رکھ دیئے۔ آگے اللہ مالک ہے ـــــ حَسْبِیَ اللّٰہُ وَنِعْمَ الْمَوْلٰی وَنِعْمَ النَّصِیْرُ

اگر آپ ہمارے اس اقدام کو غیر ضروری سمجھتے ہیں تو ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ اور اگر ضروری سمجھتے ہیں تو یقیناً اور لازماً تعاون کا جذبہ بھی بیدار ہوچکا ہوگا۔

"اسلام ہی کیوں" آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اہلِ ایمان کی

ذمہ داری ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو اس کی خامیوں اور کوتاہیوں سے آگاہ کریں۔ البتہ غیبت اور دشنام طرازی حرام ہے۔

وَالسَّلَامُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی۔

خاکسار:
پیام اعظمی

عقل

میں اپنے وجود سے انکار نہیں کر سکتا۔!

اس لئے کہ میں:

سوچتا ہوں اور محسوس کرتا ہوں ـــــ سوچنا، غور و فکر کرنا اور نتائج نکالنا میرے وجود کا لازمہ ہے۔

اس لئے کہ میں انسان ہوں!ـــــ یہی وہ خصوصیّت ہے جو مجھے زمین پر بسنے والے تمام حیوانات کے درمیان ممتاز بناتی ہے۔ اگر یہ صفت مجھ میں نہ ہوتی تو مجھ میں اور دوسرے جانداروں میں کوئی فرق نہ ہوتا۔ سوچنا اور فیصلے کرنا میرے انسانی وجود کا پہلا تقاضا اور سب سے بڑی ضرورت ہے۔ میں اپنے بشری وجود کے اس تقاضے کو معطل کر کے حیوانوں کی صف میں کھڑا ہونے کے لئے تیار نہیں ہوں۔

میں اپنی اس صلاحیّت کو کام میں لاکر معروفات سے مجہولات کا پتہ لگاتا ہوں۔ دیکھی ہوئی چیزوں کے آئینے میں ان دیکھی چیزوں کا چہرہ دیکھ سکتا ہوں۔ اٹھتے ہوئے دھوئیں کو دیکھ کے اس کے پس منظر میں سلگتی ہوئی آگ کا علم حاصل کر لیتا ہوں۔ جلتا ہوا بلب مجھے دھات کے تاروں کے سینے میں چھپی ہوئی "برقی رو" کی اطلاع دے دیتا ہے، رقص کرتے ہوئے بجلی

کے پنکھے کو دیکھ کر نظر نہ آنے والی بجلی کی لہروں کا علم حاصل کر لیتا ہوں۔

میں جب اپنے کمرے میں ریڈیو سے وہ آوازیں سنتا ہوں جو اسی وقت سیکڑوں میل دور ریڈیو اسٹیشن سے نشر ہو رہی ہیں تو مجھے ان نادیدہ ریڈیائی لہروں کا یقین ہو جاتا ہے جو اس طویل فاصلے کے باوجود مواصلاتی رابطہ قائم کئے ہوئے ہیں۔

یعنی جہاں میری بصارت آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے وہاں سے میری بصیرت اپنے قدم آگے بڑھاتی ہے اور مشاہدات کی سرحد پار کر کے ان جہانوں کی سیر کراتی ہے جو عالم شہود سے زیادہ وسیع اور تہہ دار ہیں۔

میں جانتا ہوں کہ "ہر عالم ظاہر" کے پیچھے ایک "عالم غیب" بھی ہے۔ جس کا ادراک میں اسی عقل و شعور کے ذریعے کرتا ہوں جو میرے وجود کا لازمہ ہے۔ جن کے ذریعے میں ان چیزوں تک رسائی حاصل کر لیتا ہوں، جو میرے "حواسِ خمسہ" کی گرفت میں نہیں آسکتیں۔

میرے دامنِ معلومات میں ان چیزوں کی تعداد کم ہے جنھیں میری نگاہوں نے دیکھا ہے، کانوں نے سُنا ہے، زبان نے چکھا ہے، ہاتھوں نے چھوا ہے یا قوتِ شامہ نے سونگھا ہے۔ ان چیزوں کی تعداد بہت زیادہ ہے جنھیں نہ میں دیکھ سکتا ہوں، نہ میں سونگھ سکتا ہوں، نہ سن سکتا ہوں، نہ چکھ سکتا ہوں، نہ ان کا لمس محسوس کر سکتا ہوں۔

مجھے بے شمار غیر مرئی چیزوں کے وجود کا یقین ہے۔ یہ یقین ان کے

آثار سے حاصل ہوتا ہے جو مرئی اجسام سے ظاہر ہوتے ہیں۔

کیا یہ یقین غلط ہے؟ کیا جلتا ہوا "بلب" دیکھنے کے بعد بھی برقی رو کے وجود کا انکار کر دوں؟ کیا بجلی کے پنکھے بغیر کسی قوت کے حرکت کر رہے ہیں؟ کیا زمین کی قوتِ جاذبہ کا انکار کر دوں؟ کیا ہواؤں میں موجود "آکسیجن" کا انکار کر دوں؟ کیا غذاؤں میں پوشیدہ "حیاتین" کا انکار کر دوں؟ کیا میں عالمِ مادیات میں موجود ٹھوس چیزیں، سیالات اور بخارات کا اقرار کر لوں؟ کیونکہ وہ میرے حواس کی دسترس میں ہیں مگر توانائیوں کا انکار کر دوں کہ وہ میرے حواس کی گرفت میں نہیں آتیں۔

نہیں میں اپنی عقل کے فیصلوں کو جھٹلا نہیں سکتا! میں اپنے وجود کے ساتھ اتنا بڑا ظلم نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ محسوسات دھوکا دے سکتے ہیں مگر عقل کبھی دھوکا نہیں دیتی۔

مجھے یقین ہے کہ عقل کے فیصلے ریاضی کے نتیجوں کی طرح قطعی اور ناقابلِ انکار ہوتے ہیں۔ خواہ وہ کسی دیہاتی عورت کی عقل ہو یا شہری پروفیسر کی عقل۔

جس طرح "ریاضی" مختلف اعداد و شمار سے "اثبات و نفی" کے ذریعے صحیح نتیجہ نکالنے کا عمل انجام دینے کا نام ہے، ٹھیک اسی طرح عقلِ انسانی معلومات و مشاہدات کو ترتیب دے کے صحیح نتیجہ نکالنے کا عمل انجام دیتی ہے اور نامعلوم کو معلوم بنا لیتی ہے۔

اگر ریاضی کا کوئی طالب علم اپنے حساب میں غلط اعداد شامل کر کے یا کسی

صحیح عدد کو نظر انداز کر کے غلط نتیجہ نکالتا ہے تو یہ علم ریاضی کا قصور نہیں بلکہ اس طالب علم کی غلطی ہے۔

یونہی اگر کوئی انسان اپنی خواہشات، پسند و ناپسند اور جہالت سے مغلوب ہو کے زیر غور مسئلوں میں مشاہدات و معلومات کی غلط ترتیب یا مفروضات کی بنیاد پر غلط نتائج نکالتا ہے تو یہ "عقل" کا نہیں بلکہ اس نتیجہ نکالنے والے کا قصور ہے۔

اس لئے مجھے یقین ہے کہ انسان اگر اپنی عقل کو دھوکا دینے کی کوشش نہ کرے تو عقل انسان کو کبھی گمراہ نہیں کرتی۔

اگر میں عقل کے فیصلوں کا انکار کر دوں تو مجھے کہنا پڑے گا کہ دنیا میں جھوٹ سچ، حق و باطل، صحیح و غلط کا وجود ہی نہیں ہے کیونکہ ان کے درمیان امتیاز قائم کرنے کا کوئی معیار ہی نہیں ہے۔ میں ایسا نہیں کر سکتا مجھے یقین ہے کہ اندھیرے اجالے میں فرق قائم کرنے والی واحد کسوٹی عقل ہے۔

دنیا میں جتنے بھی نظریاتی اختلافات نظر آتے ہیں وہ سب انسان کی نفسیاتی خواہشات کی پیداوار ہیں عقل ان کی ذمہ دار نہیں۔

یہی عقل میرا پہلا اور آخری سہارا ہے اور جادۂ حیات میں یہی میری رہبر و رہنما ہے۔ اور اسی عقل کی انگلی تھام کے زندگی کے سفر میں اپنا قدم آگے بڑھا رہا ہوں۔...

ربوبیّت

میرے سر پر تاروں بھرا آسمان کا شامیانہ اور پاؤں کے نیچے زمین کا وسیع ترین فرش ہے۔ میرے گرد و پیش متحرک اور جامد، جاندار اور بے جان اجسام و اجرام کا لامتناہی سلسلہ پھیلا ہوا ہے۔ اس زمین پر میں تنہا نہیں ہوں بلکہ لاتعداد حیوانات میرے ساتھ اس بزم ہستی میں زندگی گزار رہے ہیں۔

میں دیکھتا ہوں کہ یہ زمین ایک ایسی پرورش گاہ ہے جہاں سب کی پرورش ہو رہی ہے۔ سب کو اس کی ضرورت کے مطابق رزق مل رہا ہے۔ سب بقدر ظرف اپنا حصّہ حاصل کر رہے ہیں۔ ان دیکھے ہاتھ سب کو پال رہے ہیں۔ زمین پر رینگنے والا چیونٹی جیسا ننھا مُنّا کیڑا ہو یا ہاتھی جیسا بھاری بھر کم چوپایہ، دونوں ایک ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ سینۂ گیتی دونوں کے لئے آغوشِ مادر بنا ہوا ہے۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ ـــــ اس محفلِ حیات میں شامل وہ بھی ہیں جو خشکی پر قدم نہیں رکھ سکتے، وہ بھی ہیں جو پانی میں ایک بھی سانس نہیں لے سکتے، وہ بھی ہیں جنھیں زمین پر اترنا گوارا نہیں، وہ بھی ہیں جنھیں ہوا میں بلند ہونے کا یارا نہیں، وہ بھی ہیں جنھیں شام کی تاریکی بے دست و پا کر دیتی ہے، وہ بھی ہیں جو صرف پردۂ شب کو اپنا میدانِ عمل بنا سکتے ہیں، وہ بھی ہیں جو سمندروں کی تہہ

میں زندگی گزار رہے ہیں، وہ بھی ہیں جو پہاڑوں کی بلند ترین چوٹیوں پر دادِ حیات دے رہے ہیں، وہ بھی ہیں جو غذا کی تلاش میں ہر دم رواں دواں رہتے ہیں، اور وہ بھی ہیں جو چٹانوں کے بیچ بے دست و پا پڑے لقمۂ تر کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔

سب کی ضرورتیں الگ، سب کی غذائیں مختلف، سب کا رزق جدا۔ کچھ گوشت خور ہیں، کچھ سبزی خور ہیں، کچھ غلاظت خور ہیں ـــــ مگر کوئی محروم نہیں، کوئی مایوس نہیں، سب اپنے اپنے حصّے کا رزق پا رہے ہیں، سب کو اپنی اپنی غذا مل رہی ہے۔

میں سوچتا تھا کہ وہ طائرانِ ہوا جو کبھی زمین پر قدم نہیں رکھتے آخر ہواؤں میں پرواز کر کے اپنی غذائی ضرورت کیسے پوری کر لیتے ہیں؟ مگر ایک دن شام ہو رہی تھی، برسات کا موسم تھا، فضا کی بلندیوں میں بہت سے طائرانِ ہوا محوِ پرواز تھے، اتنے میں میری نظر گیلی زمین پر پڑی جہاں چھوٹے چھوٹے متعدد سوراخوں سے بے شمار پتنگے نکلنا شروع ہوئے اور جھنڈ کے جھنڈ فضا میں بلند ہو کے اڑ گئے یہاں تک کہ ان چڑیوں کے حدودِ پرواز میں شامل ہو گئے جن کے لئے یہ کیڑے لقمۂ تر کی حیثیت رکھتے تھے اور دامنِ ہوا ان کے لئے دسترخوان بنا ہوا تھا۔

فوڈ سپلائی کا یہ انوکھا طریقہ، تقسیمِ رزق کے مضبوط نظام کی گواہی دے رہا تھا۔

میں دیکھتا ہوں کہ پردۂ شب میں کھلنے والے پھول عموماً سفید اور خوشبودار ہوتے ہیں جبکہ دن، دوپہر میں کھلنے والے پھول رنگین اور تیز خوشبو سے محروم ہوتے ہیں ..... آخر ایسا کیوں ہوتا ہے، عقل توجیہہ کرتی ہے کہ ان پھولوں کے سینے میں شیرینی کا ایک ننھا سا قطرہ رکھا ہوا ہوتا ہے جو نرم و نازک اور رنگ برنگی "تتلیوں" کی غذا ہے ـــــ دن کے اجالے میں وہ اپنے اس غذائی ذخیرہ تک آسانی سے پہونچ سکتی ہیں۔ پھول کسی بھی رنگ کے ہوں وہ انھیں دیکھ لیں گی بلکہ رنگینی دن کے اجالے میں نمایاں اور سفیدی پنہاں ہو جاتی ہے۔ رات کی تاریکی میں رنگین پھول دکھائی نہ دیں گے خوشبو کا فقدان یا کمی ان کی راہ نمائی نہ کر سکے گی ... اندھیرے میں تیز خوشبو اور سفیدی ان کو راستہ بتاتی ہے اور وہ آسانی سے اپنی غذا حاصل کر لیتی ہیں۔

تقسیمِ رزق کا کیسا کریمانہ سلسلہ ہے جو نہ اندھیرے میں رکتا ہے نہ اجالے میں۔ بابِ کرم دن میں بند ہوتا ہے نہ رات میں۔

میں دیکھتا رہتا ہوں کہ جنھوں نے ابھی زمین پر قدم بھی نہیں رکھا ہے ان کے لئے "شیر مادر" کی شکل میں غذا کی ذخیرہ اندوزی کی جا رہی ہے۔ تاکہ واردانِ بزمِ حیات کی فوری ضرورت پوری کی جا سکے۔ ناقابلِ انکار میزبانی آنے والے مہمانوں کی ضیافت کا انتظام پہلے سے کر رہی ہے ـــــ مجھے کسی کتاب کی ورق گردانی کی ضرورت نہیں، کسی مکتبۂ فکر کا سہارا درکار نہیں، کسی استاد کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرنے کی ضرورت نہیں ـــــ

کیونکہ میں اس بیکراں رزّاقیّت، لامتناہی ربوبیت اور پروردگاری کا اپنے وجود اور اپنے نفس کی طرح ادراک کر رہا ہوں جو پوری کائنات کو اپنے آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے..." ★★★
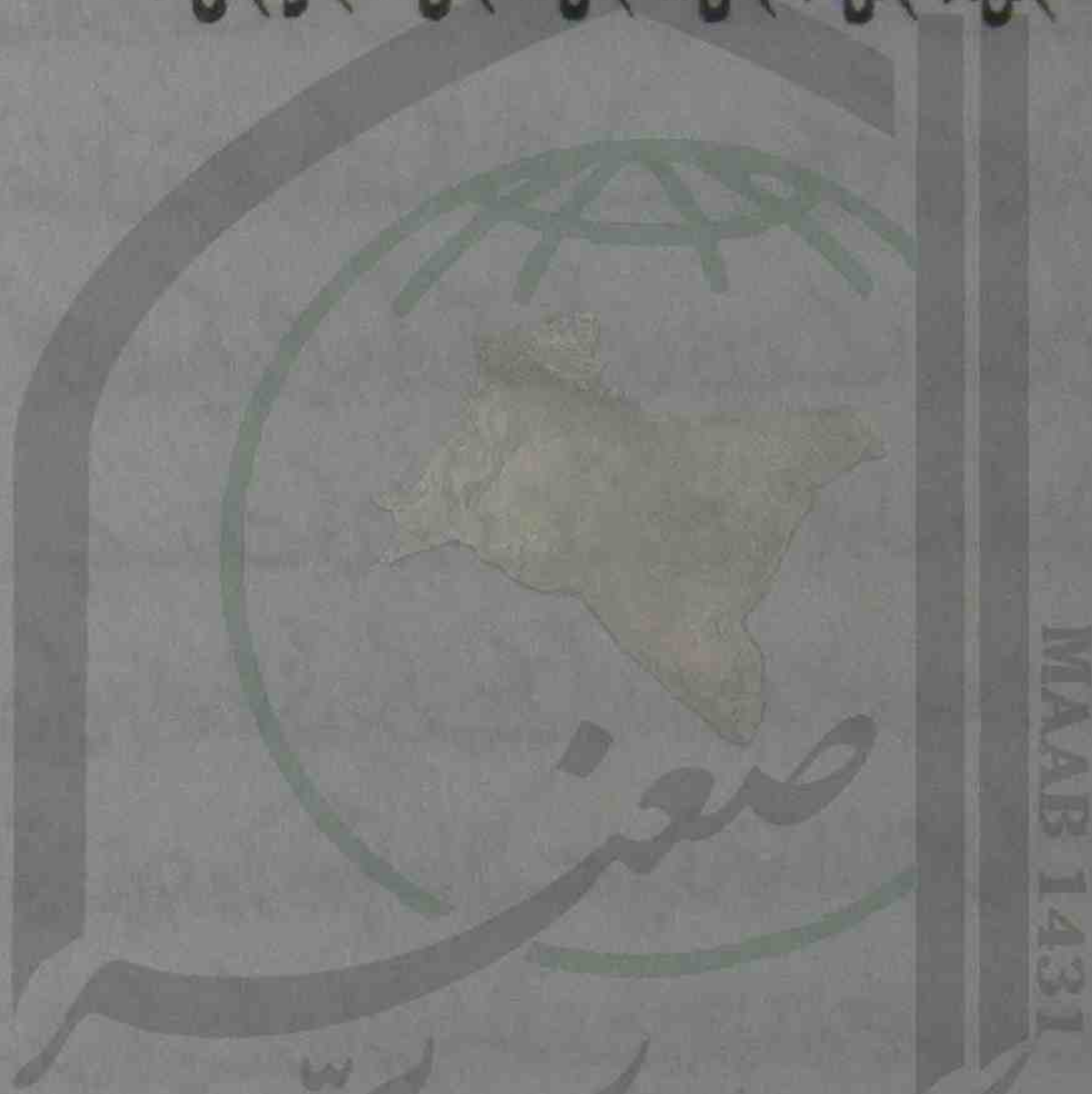
حکمت

میں دیکھتا ہوں ۔

پھولوں کے دامن میں رکھا ہوا شیرینی کا ننھا سا قطرہ ایک طرف تتلیوں کے لئے غذا فراہم کرتا ہے تو دوسری طرف پھولوں کے "لطیف ذرات تناسل" کی حفاظت بھی کرتا ہے اور انھیں ہوا کے جھونکوں سے منتشر ہو کے ضائع ہو جانے سے بچاتا ہے، سورج کی کرنیں جب تیر اندازی کرتی ہیں تو وہ ان کے لئے سینہ سپر ہو جاتا ہے۔ اور پھر ان ذرات کے ساتھ تتلیوں کے پیروں میں چپک کے دوسرے پھولوں تک رسائی حاصل کر کے ان کے درمیان "رشتۂ ازدواج" قائم کر دیتا ہے ـــ گویا یہ ننھے ننھے پرندے مفت خور نہیں ہیں بلکہ اس غذا کے بدلے پھولوں کے درمیان رابطے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

مٹھاس کے ان ننھے قطروں کو دنیا بھر کے انسان مل کے بھی جمع نہیں کر سکتے تھے۔ مگر شہد کی مکھیاں انھیں جمع کر کے خود اپنی اور اپنے بچوں کی پرورش بھی کرتی ہیں اور شہد کی ایک بڑی مقدار انسانوں کے حوالے کر دیتی ہیں جو بہترین غذا کے ساتھ مختلف بیماریوں میں پیغام شفا بھی ہے۔

کیا میں باہمی تعاون کے اس حکیمانہ نظام کا انکار کر دوں جسے پورے

ہوش و حواس کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔

صبح کا منظر میرے سامنے ہے۔ بقولِ شاعر ؎

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا

تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

بھیگے ہوئے پودے، سبزہ زار پر چمکتے ہوئے شبنم کے قطرے زبانِ حال سے آواز دے رہے ہیں کہ کسی نے رات بھر چھڑکاؤ کیا ہے۔ مگر پردۂ شب چاک کر کے جب سورج نکلا تو میں نے دیکھا کہ آفتاب کی شعاعیں درختوں کے پتوں کی نمی اور گھاس پر بکھرے ہوئے اوس کے قطروں کو ہوا میں تحلیل کر رہی ہیں۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے، پیڑ پودے، سبزہ زار کی نمی اور تری خشکی میں بدل گئی۔ اوس کی بوندیں ہوا میں اڑ گئیں۔

میں نے عقل سے سوال کیا کہ ایسا کیوں ہوا؟ عقل نے جواب دیا اگر درختوں اور پودوں کی نازک پتیاں ہر وقت بھیگی رہیں گی تو سڑ کے گل جائیں گی اور اگر ہر وقت خشک رہیں تو سوکھ کے جھڑ جائیں گی۔ اس لئے رات کو بھگو دی جاتی ہیں اور دن کو خشک کر دی جاتی ہیں۔

میں پورے یقین کے ساتھ اس "تدبیر" کا ادراک کر رہا ہوں جو محفلِ برگ و بار میں مصروفِ عمل ہے۔

میں جب فلک بوس پہاڑوں پر نظر ڈالتا ہوں اور برف پوش

چوٹیوں کو دیکھتا ہوں تو اس نظام کی ہیبت کے احساس میں ڈوب جاتا ہوں۔
آبِ شیریں کا اتنا بڑا ذخیرہ اور وہ بھی پہاڑ کی نوکیلی اور مدوّر چوٹیوں پر؟
نشیب میں مرنے والا پانی زمین کی آخری بلندی پر جمع کر دیا گیا ہے۔ فرازِ کوہ
ظرفِ آب بنا ہوا ہے ــــ برف سورج کی تپش سے پگھل پگھل کے نیچے کی طرف
بہتی رہتی ہے اور نشیبی علاقوں میں آباد مخلوق کو سیراب کرتی ہوئی دریاؤں
کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اور دریا بارش کے پانی کے ساتھ باشندگانِ ارض
کے لئے آبِ حیات کا کام کرتے ہیں۔ اس برفاب کا کچھ حصہ بلند پہاڑوں کے
سوراخوں سے گذر کے جگہ جگہ ان چشموں کی شکل میں ابلتا رہتا ہے جو تشنہ کاموں
کے لئے فیضانِ رحمت بنے ہوئے ہیں۔

واٹر سپلائی کا کیسا مضبوط انتظام ہے؟ گرمی زیادہ پڑتی ہے تو برف
بھی زیادہ پگھلتی ہے۔ اس لئے کہ گرمی میں پیڑ پودوں، انسانوں اور جانوروں
کی پیاس بڑھ جاتی ہے، سردی زیادہ پڑتی ہے تو برف کم پگھلتی ہے۔ کیونکہ
سردیوں میں ان کی پیاس کم ہو جاتی ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ کوئی ساقی پردہ نشیں ظرفِ قدح خوار دیکھ کر ساقی گری
کر رہا ہے۔

میں نے جوش کھاتے ہوئے سمندروں کو دیکھا ہے!
اتنا بڑا آبی ذخیرہ جو لاکھوں صدیوں سے حیوانات و نباتات کی پیاس

بجھا رہا ہے۔ انھیں زندگی عطا کر رہا ہے۔ مگر اس کی مقدار میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ جتنا پانی روزِ اوّل اکٹھا کر دیا گیا تھا اتنا ہی پانی آج بھی موجود ہے ــــ اگر وہ تمام پانی پھیلا دیا جاتا تو پوری دنیا غرق ہو جاتی۔ اس لئے اسے الگ جمع کر کے آبادی کے لئے خشکی کا حصّہ چھوڑ دیا گیا۔ اور اس پانی کو عفونت اور آلودگی سے بچانے کے لئے انتہائی "شور" بنا دیا گیا ہے، اتنا "شور" کہ کوئی اس کا ایک گھونٹ بھی نہیں پی سکتا۔ ساتھ ہی ساتھ اس شوریدگی نے سمندر کے پانی کا وزن بھی بڑھا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے جہاز اور کشتیاں آسانی سے محوِ سفر ہیں۔

اس ناقابلِ استعمال پانی کو قابلِ استعمال بنانا کس کے بس میں تھا؟ ــــ اگر سمندر کا پانی بغیر "فلٹریشن" کے برسنے لگے تو کچھ ہی دن میں ساری دنیا نمک کی تہوں میں دفن ہو جائے گی۔ مگر سورج کی کرنیں نمک کو سمندر میں چھوڑ دیتی ہیں، اور خالص پانی بھاپ بن کر اڑ جاتا ہے۔ گویا مانسون "قرمبیق" اِس آبِ شور کا عرق کشیدہ کر کے بادلوں کے حوالے کر دیتی ہے، بادل اپنی چھاگلیں چھلکا رہے ہیں، چرند، پرند، پیڑ، پودے سب سیراب ہو رہے ہیں۔ اور پھر استعمال شدہ فاضل پانی دریاؤں کے ذریعہ واپس سمندر میں پہونچا دیا جاتا ہے۔ پھیلانے اور سمیٹنے کا کام جاری ہے۔

آبیاری کا اتنا حکیمانہ انتظام اور سینچائی کا ایسا مستحکم محکمہ اگر چند دن کے لئے معطل کر دیا جائے تو زمین پر زندگی کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے۔

میں نے ایک دن دیکھا کہ غلاظت کا ایک ڈھیر راستے میں پڑا ہوا ہے میں ناک پر رومال رکھ کے گذر گیا۔ تیسرے دن جب ادھر سے گذرا تو "بدبو" کم ہوچکی تھی، پلٹ کے دیکھا تو غلاظت کی جگہ بے شمار کیڑے رینگ رہے تھے جو اسی غلاظت سے پیدا کئے گئے تھے اور وہی ان کی غذا بھی تھی ــــ چوتھے دن دیکھا کہ پرندے اور دوسرے زمین پر رینگنے والے جاندار ان کیڑوں کو خوانِ نعمت سمجھ کے نوش فرما چکے تھے۔ اب نہ غلاظت نہ کیڑے۔

صفائی کا کیسا محکم بندوبست ہے؟ یہ محکمہ اگر چند دن کے لئے معطل کر دیا جائے تو اس کے نتیجے میں پھیلنے والی بیماریوں سے انسانوں کو نہ کارپوریشن بچا سکتا ہے نہ میونسپل بورڈ۔

کیسی ہے حکیمانہ طہارت پسندی ہے، جو فضا کی آلودگی کو ہوا سے، ہوا کی آلودگی کو بارش سے، زمین کی آلودگی کو برسنے والے پانی سے، غلاظت کو ان میں پڑ جانے والے کیڑوں سے، اور کیڑوں کو پرندوں کے ذریعہ ــــ اور انسانوں کے دل و دماغ میں اکٹھا ہو جانے والی معنوی آلائشوں کو شدائد اور مشکلات کے ذریعے زائل کر دیتی ہے۔

میری عقل ایک لمحے کے لئے بھی راضی نہیں کہ میں اس حکمت کا انکار کر دوں جو کائنات کے اس حکیمانہ نظام کو سنبھالے ہوئے ہے۔
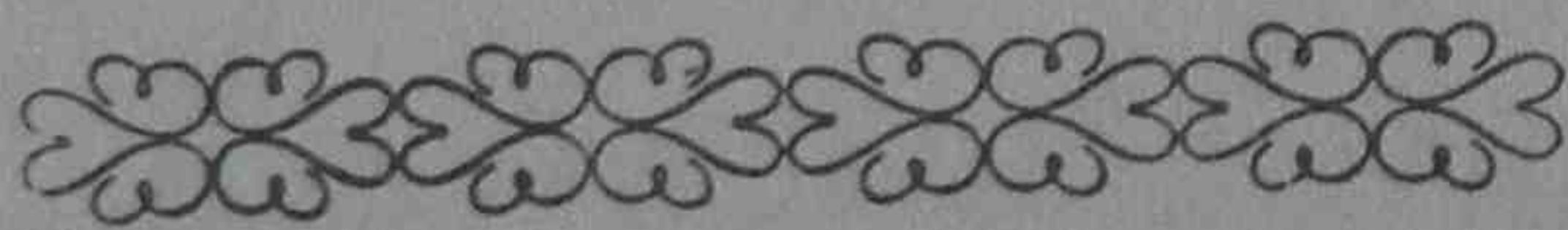
علم و ارادہ

میں جانتا ہوں کہ یہاں نباتات کی کثرت ہوتی ہے وہاں بارش بھی زیادہ ہوتی ہے۔ سرسبز وادیوں میں برسنے والے بادل بے گیاہ ریگستانوں میں اپنا پانی ضائع نہیں کرتے۔

میں نے خلیج کے ریگزاروں کو دیکھا ہے۔ یہ ریگستانی علاقے جنھیں بادلوں کے قافلے ہمیشہ نظر انداز کرتے چلے آرہے تھے اور یہ بے گیاہ خطے بارش سے ناآشنا تھے۔ مگر جب وہاں کی سوکھی زمین نے "تیل" کے خزانے اگل کے بتایا کہ دنیا کا کوئی خطہ سامانِ حیات سے محروم نہیں رکھا گیا ہے۔ اور پھر اس دولت کے سہارے خوبصورت ترین شہر آباد ہوگئے۔ تو وہاں کی حکومتوں نے بے اندازہ دولت صرف کر کے انھیں سبزہ زار بنا دیا۔ دوسری جگہوں سے مٹی لائی گئی، اس پر گھاس اگائی گئی، پیڑ پودے لگائے گئے درختوں کی جڑوں میں ہر وقت پانی پہونچانے کے لیے "پائپ" فٹ کیے گئے۔ جن سے انھیں ہر وقت نمی ملتی رہے، نتیجتاً چند برسوں میں وہاں سڑکوں پر درخت بھی نظر آنے لگے۔ روشیں بھی آباد ہوگئیں، سبز و شاداب "پارک" اور گلزار بھی آباد ہوگئے ـــ پھر ایسا ہوا کہ وہاں بارش کی مقدار بھی بڑھ گئی۔ برسات سے ناآشنا علاقے بادلوں کی نگاہِ لطف کا مرکز بننے لگے ـــ ابھی چند سال پہلے ابوظبی میں اتنی بارش ہوگئی تھی کہ آمد و رفت کے راستے بند ہوگئے

پانی نکالنے کے لئے فوج کی خدمات طلب کر لی گئیں۔ چونکہ وہاں اتنی بارش کا پہلے سے کوئی تجربہ نہیں تھا اور اخراجِ آب کے راستوں پر کوئی توجّہ نہیں دی گئی تھی اس لئے سیلاب جیسی کیفیت پیدا ہو گئی۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایسا کیوں ہوا؟۔۔۔ بادلوں کو کس نے بتا دیا کہ اب ان ریگزاروں میں تشنہ لب پودے تمہارا انتظار کر رہے ہیں؟۔ اب تمہارا پانی ضائع نہ ہوگا۔

اس کا مطلب ہے کہ بادلوں کی پشت پر کارفرما کوئی اندھی قوّت نہیں ہے۔ بلکہ "علم وخبر" کے ہاتھ اسے سنبھالے ہوئے ہیں۔ کوئی "نگراں قوت" جو زمین کے کسی حصّے سے غافل نہیں، خبر گیری کر رہی ہے۔۔۔ ضرورت مندوں کو محروم رکھنا جسے گوارا نہیں۔

میری نگاہیں دیکھ رہی ہیں کہ اس کارگاہِ حیات میں متحرّک اور غیر متحرک جانداروں کی بے شمار قسمیں زندگی گزار رہی ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر ان میں گوشت خوروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے تو وہ رفتہ رفتہ سبزی خور جانوروں کو ہضم کر جائیں گے۔ اور پھر ان کا خاتمہ ہو جائے گا۔ سبزی خور جانوروں کی عدم موجودگی کے نتیجے میں نباتات اتنے بڑھ جائیں گے کہ زمین پر انسانوں کی رہائش ناممکن ہو جائے گی۔

اور اگر سبزی خور جانداروں کی تعداد حدِ اعتدال سے بڑھ جائے تو

ایک دن نباتات کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ نتیجہ میں ایک دن وہ خود بھی ختم ہو جائیں گے اور زمین برہنہ ہو کر انسانوں کے قیام کو ناممکن بنا دے گی۔

اگر کیڑے مکوڑوں کی تعداد بڑھ جائے تو سبزہ زار ختم ہو جائیں گے۔ اگر کم ہو جائے تو پرندے بھوکوں مر جائیں گے۔۔۔ الغرض کسی ایک جنس کا حدِ اعتدال سے بڑھ جانا یا گھٹ جانا، پوری انجمنِ حیات کو تباہ کر دینے کے لئے کافی ہے۔ مگر "ماحولیاتی توازن" آواز دے رہا ہے کہ کسی کی نگاہِ عدالت اس "بزمِ ہستی" کی نگرانی کر رہی ہے۔

میں جب بزمِ حیات سے نظر ہٹا کے خود اپنے چھوٹے سے وجود اور مختصر سی ذات کو دیکھتا ہوں تو مجھے اس میں ایک "عالمِ اکبر" دکھائی دیتا ہے۔

تقریباً دس ملین ملیارڈ (۱۰،۱۰) خلیوں (CELLS) سے اس پیکرِ وجود کی تشکیل ہوئی ہے۔ جو ایک مضبوط سلطنت اور وسیع مملکت کی طرح مختلف شعبوں کا حامل ہے اور ہر شعبہ اپنی کارکردگی میں مصروف ہے میرے جسم کا ایک ایک جزء میرے لئے ایک کتابِ حکمت و دانائی ہے۔

میرے جسم کے کسی حصّے پر اگر ایک مکّھی یا مچّھر بھی بیٹھ جائے تو خبر رسانی کا مستعد محکمہ اعصابی تاروں کے ذریعے اس کی اطلاع میرے دماغ تک پہونچا دیتا ہے۔

اگر جسم کے کسی حصّے پر ہلکا سا زخم بھی آجائے تو بدن کے محافظ دستے یعنی خون کے سُرخ ذرّات دوڑ پڑتے ہیں اور زخمی یا مضروب مقام پر گھیرا

ڈال دیتے ہیں۔ بدن کو نقصان پہونچانے والے مادّوں سے دفاعی جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ حفاظتی دستے کام آتے رہتے ہیں مگر دشمن کو مملکت بدن کے اندر داخل نہیں ہونے دیتے اور رفتہ رفتہ دشمن جرثومے شکست کھا کے فنا ہو جاتے ہیں اور پھر زخم کو مندمل کرنے والے اجزا، اپنا فرض پورا کرتے ہیں۔

میرے جسم کی بیرونی کھال جو "شہر بدن" کے لئے "شہر پناہ" کا کام کرتی ہے، کہیں سخت ہے کہیں نرم، کہیں زیادہ حساس ہے کہیں کم حسّاس — لیکن یہ فرق میری ضرورت کے عین مطابق ہے — ہتھیلیوں کی کھال سخت ہے کہ ان سے مجھے اٹھانے اور پکڑنے کا کام کرنا ہے پاؤں کے تلوؤں کی کھال اس سے بھی زیادہ سخت ہے کہ انھیں پورے جسم کا بوجھ اٹھا کے ہموار اور ناہموار راستوں سے گزرنا ہے۔

میرے بدن میں لاکھوں نکاسی کے دروازے "مسامات" کی شکل میں کھلے ہوئے ہیں، جن کے ذریعے یہ جسم حرارت، توانائی اور حیاتین درآمد کرتا ہے فاضل حرارت اور پسینے کی شکل میں استعمال شدہ رطوبت خارج کرتا ہے — مگر جہاں کوئی خطرہ سامنے آتا ہے یا ہواؤں کی سرد اور نامانوس لہریں جسم سے ٹکراتی ہیں یہ مسامات اپنے دروازے بند کر لیتے ہیں تاکہ دشمن کو دخل اندازی کا موقع نہ ملے۔ رونگٹے اس طرح کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جیسے سرحد کے حفاظتی دستے صف بستہ ہو جائیں۔

اس بیرونی کھال کے نیچے، شریانوں[1]، وریدوں[2]، اعصاب اور عضلات[3]

---

[1] Artery [2] Vein [3] Tissue

کا جال بچھا ہوا ہے۔ سب اپنے اپنے معین فرائض کی ادائیگی میں مقررہ طریقوں کے ساتھ ہمہ وقت مصروف ہیں۔

اعصاب جو خبر رسانی کی ذمہ داری سنبھالے ہوئے ہیں، جسم کے اندر یا باہر ہونے والی تبدیلیوں کی خبر پورے امتیاز اور وضاحت کے ساتھ مثلاً سردی، گرمی، درد، سوزش، چبھن، کسک، جلن جیسے بے شمار اور مختلف احساسات کے ذریعہ دماغ تک پہونچا رہے ہیں۔

عضلات تقریباً دُو سَو چھ ہڈیوں کے ٹکڑوں کو آپس میں اس طرح جوڑے ہوئے ہیں کہ وہ مربوط بھی رہیں اور حرکت بھی کر سکیں ـــــــ شریانوں کے ذریعہ دل پورے جسم کو خونِ تازہ سپلائی کر رہا ہے یعنی شاعروں کی زبان کا یہ "دلِ ناداں" پوری دانائی سے اپنی ذمہ داری ادا کر رہا ہے۔ جسم زیادہ حرکت کرتا ہے تو اس کی رفتار بڑھ جاتی ہے۔ جسم پُرسکون ہوتا ہے تو اس کی رفتار کم ہو جاتی ہے یعنی ضرورت کے مطابق خدمت انجام دے رہا ہے۔ یہی دل وریدوں کے ذریعے استعمال شدہ خون واپس لے کے دوبارہ قابلِ استعمال بنانے کے لئے پھیپھڑوں کے حوالے کر دیتا ہے۔ پھیپھڑا سانس کے ذریعہ آکسیجن حاصل کر کے دل کے حوالے کر رہا ہے۔

معدہ اور آنتیں "ساکنانِ ملکِ بدن" کے لئے غذا تیار کرنے میں مصروف ہیں، جگر اس غذا کو قابلِ استعمال بنانے کے لئے "تولیدِ خون" کی ذمہ داری ادا کر رہا ہے مگر وہ ان اعضاء کا دھوون الگ کر کے مثانے

کو سونپ دیتا ہے۔ مثانہ اسے اکٹھا کر کے پیشاب کی نالیوں سے باہر نکال دیتا ہے۔

میرے کان جو تقریباً دس لاکھ "خلیوں" سے مرکب ہیں، ان کے سوراخوں پر باریک سا پردہ کس قدر حسّاس ہے کہ ہر طرح کی آوازوں کو الگ الگ شناخت کر لیتا ہے اور لاکھوں جاننے والوں کی آوازوں کو الگ الگ محسوس کرتا ہے۔ ان پردوں کے اطراف میں ایک خاص قسم کا فضلہ تہہ بہ تہہ میل کی شکل میں جمتا رہتا ہے جو کیڑے مکوڑوں کے لئے زہر قاتل ہے۔ جب کوئی کیڑا کان میں داخل ہونے کی کوشش کرتا ہے تو یہ میل انھیں چپکا لیتا ہے اور اس کا زہر انھیں ختم کر دیتا ہے کہ یہ کیڑے کان کے حسّاس پردوں تک نہ پہونچ سکیں اور پھر یہی میل ان نازک پردوں کو نرم رکھتا ہے تاکہ وہ خشک ہو کے پھٹنے نہ پائیں اور ان کی "حساسیّت" بھی باقی رہے۔ کان کے بیرونی حصّے کی ساخت ایسی ہے کہ میں نہاتا ہوں، بارش میں بھیگتا ہوں مگر پانی کا ایک قطرہ بھی کان کے اندر نہیں جانے پاتا۔ تیز ہوا کے جھونکے کانوں کے پردوں سے براہِ راست ٹکرانے نہیں پاتے ـــــ کیسی صنعت گری ہے؟ کیسی دانائی ہے؟۔

میں جب اپنی آنکھوں کی ساخت پر اس کی بناوٹ اور تخلیق پر غور کرتا ہوں تو حیرت زدہ رہ جاتا ہوں۔ متعدد پردوں پر مشتمل چھوٹی چھوٹی اور "لجلجی" گولیاں جن میں رقیق مادہ بھرا ہوا ہے ـــــ باریک باریک رگوں، اعصاب

عضلات سے اس طرح باندھ دی گئی ہیں کہ نہ الگ ہو سکتی ہیں نہ گر سکتی ہیں۔ مگر میں اپنے ارادے سے انھیں اوپر، نیچے، دائیں، بائیں گھماتا رہتا ہوں اور اس طرح ایک بڑے حلقے کو نقطۂ نظر بنا سکتا ہوں۔ دور نزدیک کی چھوٹی بڑی چیزوں کو زمین پر بکھرے ہوئے مناظر کو، آسمان پر بچھے ہوئے چاند اور ستاروں کو، بغیر جسم کو حرکت دیئے میری بصارت اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر میری آنکھیں کانوں کی طرح یا ناک کی طرح گردش نہ کر سکتیں تو میری قوتِ باصرہ کو کتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑتا؟ آنکھوں کا پردہ اتنا نازک ہے کہ چند لمحے اگر خشک رہ جائے تو اس کی چمک ختم ہو کے روشنی کے انعکاس کو قبول کرنے والی صلاحیت فنا ہو جائے اور خشکی سے نازک ترین جھلّی پھٹ جائے۔ مگر اسے محفوظ رکھنے کے لئے ہر وقت ترشّح ہوتا رہتا ہے۔ پلکیں جھپک جھپک کے متواتر پورے حلقۂ چشم کو تر کرتی رہتی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ فاضل تری کے ساتھ آنکھوں میں پڑ جانے والے گرد و غبار کو آنکھ کے گوشوں کے کوڑے دان میں اکٹھا کر دیتی ہیں تاکہ وہ آنکھوں کو کوئی نقصان نہ پہونچا سکیں۔ پلکوں پر بالوں کی قطاریں محافظ دستے کی طرح صف بستہ ہیں اور کسی دروازے پر پڑی ہوئی چلمن کی طرح سورج کی سیدھی شعاعوں سے، ہوا میں اڑنے والے ذرّوں سے، پیشانی سے بہنے والے پسینے سے آنکھوں کی حفاظت کر رہی ہیں۔ آنکھوں کے اوپر "بھویں" جو آنکھوں کے شیش محل کے لئے بارجے کا کام کرتی ہیں۔ دھوپ میں یہ محرابیں آنکھوں پر سایہ فگن ہیں۔ تیز

روشنی سے بیضۂ چشم کی حفاظت کرتی ہیں۔ برسنے والے پانی کو آنکھوں میں نہیں جانے دیتیں۔ یہ ابرو میرے چہرے کی آبرو ہیں۔ کیا دنیا میں کوئی ایسا کیمرہ بھی ہے جو بغیر علم و ارادے کے عالمِ وجود میں آگیا ہو؟۔

اتنا بڑا کارخانہ، لاکھوں لاکھ کل پُرزوں سے بنی ہوئی میرے وجود کی سوچنے سمجھنے والی مشین کیا بغیر علم و ارادے کے عالمِ وجود میں آگئی ہی، اور چل رہی ہے۔ خود میرے ارادے سے تو یہ نہ عالم وجود میں آئی نہ میرے ارادے سے حرکت کر رہی ہے۔ میں تو خود اپنے ارادے سے ایک چھینک بھی نہیں پیدا کر سکتا، ایک جماہی بھی نہیں لے سکتا، حد یہ ہے کہ سانسوں کی آمد و رفت بھی پوری طرح میرے اختیار میں نہیں جب میں سو جاتا ہوں اور میرا ارادہ بھی سو جاتا ہے۔ جب بھی کاروبارِ تنفّس (Respiration) جاری رہتا ہی۔

مجھے یقین کرنا پڑتا ہے کہ کوئی "ارادہ" اور کوئی "علم" اس زندہ و پیچیدہ اور پُرحکمت مشین کو چلا رہا ہے جب کوئی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو اسے درست کر دیتا ہے۔ کٹی ہوئی رگوں کو ملا دیتا ہے۔ ضائع ہو جانے والے خلیوں کی خانہ پُری کر دیتا ہے۔ ٹوٹی ہوئی ہڈیوں کو جوڑ دیتا ہے ــــ ایک ماہر انجینئر کی طرح، ایک طبیب حاذق کی طرح.....

میزان و مقدار

میں زمین پر سجی ہوئی بزمِ حیات سے نگاہیں ہٹا کے جب آسمان کی وسعتوں پر نظر ڈالتا ہوں تو اس نظام کی ہیبت و جلال سے میرا وجود لرزنے لگتا ہے جو پوری کائنات کو اپنی عادلانہ گرفت میں لئے ہوئے ہے۔

ناقابلِ شمار ستاروں سے سجا ہوا یہ آسمان ـــ لاتعداد کہکشاؤں سے آباد یہ فضائے بسیط، جس میں ہمارا کرۂ ارض بھی شامل ہے ـــ جس کی حیثیت ریگستان میں ریت کے ایک ذرّہ سے زیادہ نہیں۔

ان جگمگاتے ہوئے ستاروں میں ثوابت بھی ہیں سیارے بھی، آفتاب بھی ہے ماہتاب بھی، دکھائی دینے والے بھی ہیں نہ دکھائی دینے والے بھی۔ الگ الگ بھی ہیں اور اپنے جھرمٹ میں بھی۔

سب کے سب معین رفتار سے طے شدہ فاصلوں کے ساتھ، مقررہ راستوں پر رواں دواں ہیں ـــ ایک ان دیکھی طاقت، ایک نہ دکھائی دینے والا رشتہ سب کو آپس میں جوڑے ہوئے ہے ـــ سب آپس میں منضبط اور منظم ہیں ـــ کثرت کا مجموعہ وحدت کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ سب ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں اور ایک دوسرے سے اثر پذیر بھی، سب ایک دوسرے کے محرک بھی ہیں اور متحرک بھی۔ کسی کی حکیمانہ بندش سب کو

ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم بنائے ہوئے ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ اگر ہماری زمین اور سورج کا درمیانی فاصلہ کم کر دیا جائے تو زمین پر موجود ہر چیز جل بھن کے خاکستر ہو جائے اور یہ فاصلہ بڑھ جائے تو ہر شے برف کے مقبرے میں دفن ہو جائے۔

ہماری زمین تقریباً پندرہ سو کیلومیٹر فی گھنٹہ کی رفتار سے اپنے مدار پر گردش کر رہی ہے اگر یہ رفتار کم ہو کے مثلاً پانچ سو کیلومیٹر فی گھنٹہ ہو جائے تو ۳۶ گھنٹے کا دن اور ۳۶ گھنٹے کی رات ہو جائے گی ــــ نتیجے میں پہلا ہی دن نہ جانے کتنے جانداروں کے لئے پیغامِ موت بن جائے گا اور جو طویل دن کی حدت سے بچ جائیں گے طویل رات اپنی برودت سے انھیں فنا کر دے گی۔ ایسی صورت میں زمین پر زندگی کا وجود ناممکن ہو جائے گا۔

اور اگر زمین کی گردش تین گنی بڑھ جائے تو صرف چار گھنٹے کا دن اور چار گھنٹے کی راتیں ہوں گی چار مہینے کا ایک سال، موسموں کا سارا انتظام تہہ و بالا ہو جائے گا، ضروری حرارت نہ ملنے سے سمندروں سے مانسون کا اٹھنا بند ہو جائے گا۔ چاند بے چارہ زمین کی تیز رفتاری سے گھبرا کے اس سے رشتہ توڑ کے کہیں خلائے بسیط میں گم ہو جائے گا۔ پیڑ پودوں کی نشو و نما رک جائے گی اور زمین زندگی سے محروم ہو جائے گی۔

یہ مطابقت آواز دے رہی ہے کہ جن ہاتھوں نے زمین پر زندگی پیدا

کی ہے وہی "نظامِ فلک" کو بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔ اور یہ کروڑوں سیاروں کا قافلہ لاکھوں کہکشانوں کا کارواں جو ہر وقت فضا میں رواں دواں ہے۔ ان میں تیز رفتار بھی ہیں سست رفتار بھی۔ ایسے بھی ہیں جو چند دنوں میں اپنے مدار کا چکر پورا کر لیتے ہیں، ایسے بھی ہیں جنہیں اپنی معینہ گردش پوری کرنے میں کئی برس لگ جاتے ہیں اور ایسے بھی جنہیں اپنے ایک طواف کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ ایسے بھی ہیں جنہیں ہم آج رات کو جس جگہ اور جس وقت چمکتا ہوا دیکھیں گے دوسری رات اسی وقت اور اسی جگہ پھر دیکھ لیں گے۔ اور کچھ ایسے ہیں جو مہینوں بعد نظر آئیں گے کچھ ایسے ہیں کہ اب صدیوں بعد اپنے سفر سے لوٹیں گے اور اب ہم نہیں ہماری آنے والی نسلیں ان کی زیارت کریں گی۔ کچھ وہ بھی جنہیں ہمارے آباء و اجداد نے دیکھا تھا۔ کچھ وہ بھی جو ہماری آئندہ نسلوں کے لئے بے حجاب ہوں گے۔ الگ الگ چال، الگ الگ وزن الگ الگ حجم الگ الگ قوتِ کشش کے ساتھ ایک دوسرے سے اٹھکھیلیاں کرتے آنکھ مچولی کھیلتے ہیں ایک دوسرے کو جھکائیاں دیتے ہوئے سب فضا میں ہمہ وقت تیر رہے ہیں مگر نہ کوئی اختلال ہے نہ انتشار، نہ ٹکراؤ ہے نہ ایکسیڈنٹ ہے۔

سیاروں کی قوّتِ کشش اگر کم ہو جائے تو اپنے ساتھیوں کو چھوڑ کے کہیں خلائے بسیط میں گم ہو جائیں اور اگر بڑھ جائے تو سب ایک دوسرے سے ٹکرا کے فنا ہو جائیں۔ اگر قوتِ دافعہ بڑھا دی جائے تو ایک دوسرے کو

ڈھکیل کے دور پھینک دیں اگر قوّتِ جاذبہ بڑھ جائے تو ایک دوسرے کو چپکا لیں۔

لیکن نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند کو پکڑے نہ چاند میں طاقت ہے کہ سورج تک پہونچ جائے نہ ستاروں کے قابو میں ہے کہ آپس کا درمیانی فاصلہ کم یا زیادہ کر سکیں۔ سب کو ایک عادلانہ قوت کنٹرول (Control) کئے ہوئے ہے۔

کتنا عظیم محاسب ہے جس نے ان کی رفتار، وزن اور راستوں کا تعین کیا ہے؟

کیا میں اس "حساب" سے انکار کر دوں جس کے کاندھوں پہ یہ نظام ٹکا ہوا ہے یا پھر کہوں کہ حساب تو ہے مگر کوئی محاسب نہیں۔؟

زِندگی

میں جب بھی غور کرتا ہوں۔ میرا چھوٹا سا پیکرِ خاکی زبانِ وجود سے کسی عظیم حکمت و دانائی اور کسی لامحدود صنعت کاری کا اعلان کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

میں سوچتا ہوں کہ عالَمِ وجود میں آنے سے پہلے میں کہاں تھا؟۔ بے شعور و بے جان ذرات ایک باشعور اور زندہ پیکر میں کیسے تبدیل ہوگئے؟ مجھے علم ہے کہ میرا جسم جن عناصر سے مرکب ہے وہ پہلے سے موجود تھے۔ یعنی لوہے، تانبے، کوئلے، نمک، ہائیڈروجن، نائٹروجن وغیرہ جن کے ذرات اس بزمِ آب و گِل میں منتشر تھے۔ پھر یہ عناصر اکٹھا ہو کے انسانی پیکر میں ڈھل گئے۔ مجھے اردو کا ایک مشہور شعر یاد آتا ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزار کا پریشاں ہونا

لیکن یہ "ظہورِ ترتیب" کسی "ترتیب کار" کی گواہی بھی تو دے رہا ہے۔ ورنہ اس ترتیب کا فیصلہ کس نے کیا؟۔

کوئلے نے؟ نمک نے؟ لوہے نے؟ تانبے نے؟ ــــ وہ کون سا عنصر تھا جس نے سب سے پہلے اس "ظہورِ ترتیب" کا ارادہ کیا؟ ــــ یا پھر تمام

عناصر نے بہ اتفاقِ رائے سے یہ فیصلہ صادر فرمایا ؟۔

اگر میرا وجود صرف انہیں بے جان عناصر کا مجموعہ ہوتا تو میں آسانی سے فیصلہ کر لیتا کہ یہ صرف عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نتیجہ ہے۔ مگر تب میں یہ فیصلہ کیسے کرتا؟ اس لئے کہ میں خود بھی بے جان اور جامد عناصر کا بے شعور مجموعہ ہوتا ___ لیکن میرے وجود میں ان عناصر کے علاوہ ان مادّوں کے ساتھ عقل، زندگی اور ارادہ بھی تو شامل ہے ___ یہ بھی یقیناً میرے جسم کی تشکیل سے پہلے موجود تھے۔ ورنہ یہ کہاں سے آگئے ؟۔

میری عقل کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کسی زندگی نے مجھے زندگی عطا کی ہے، کسی ہستی نے مجھے ہستی کا مالک بنا دیا ہے کسی شعور نے مجھے شعور بخشا ہے، کسی ارادے نے مجھے صاحبِ ارادہ بنایا ہے ___ اسی نے عناصر کی تخلیق کی پھر ان بے جان و بے شعور عناصر کو باشعور و زندہ پیکر میں تبدیل کر دیا۔

یہ ممکن نہیں کہ بے ارادہ عناصر خود ہی اپنی ترتیب کر کے بااردہ بن جائیں؟ بے جان مادّے آپس میں متحد ہو کے زندگی پیدا کر لیں، عقل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں۔

مجھے یقین ہے کہ میرا وجود صرف عناصر میں ظہورِ ترتیب کا نتیجہ نہیں! کسی ارادہ و حکمت کی کارفرمائی ہے۔ اس لئے صرف عناصر کا انتشار مجھے فنا بھی نہیں کر سکتا ___ جب تک کائنات میں جاری "ارادہ" مجھ سے زندگی واپس لینے کا فیصلہ نہ صادر کر دے۔

میں جانتا ہوں کہ مرنے کے بعد میرا جسم سڑ گل کے ختم ہو جائے گا اور اس میں شامل عناصر منتشر ہو جائیں گے، اجزاء بکھر جائیں گے ــــ مگر یہ عناصر یہ اجزاء معدوم تو نہ ہو جائیں گے؟ ۔ ہو مٹی اور پانی کے دامن میں موجود رہیں گے تو پھر میں کیسے مان لوں کہ، یہ ارادہ، یہ زندگی، یہ شعور معدوم ہو جائے گا؟ ــــ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج انسانی عقل تجربات اور مشاہدات کی روشنی میں اپنے منطقی اور سائنٹیفک فیصلوں کے ذریعے اس جگہ پہونچ چکی ہے جہاں کسی جاندار کے جسم کے ایک ننھّے سے خلیے (Cell) کو محفوظ کر کے اور نشو ونما کے مناسب ماحول میں رکھ کے بالکل ویسا ہی بلکہ اسی جاندار کا دوسرا وجود سامنے لایا جا چکا ہے ــــ (Clone) کا کامیاب تجربہ آواز دے رہا ہے کہ ــــ انسانی عقل کی خالق وہ ہمہ گیر عقل، وہ بے کراں حیات جو اس بزم آب وگل کی پرورش کر رہی ہے وہ لامتناہی ارادہ جو کائنات کو اپنی گرفت میں لئے ہے۔ اگر چاہے تو دوبارہ میرے بکھرے ہوئے اجزاء کو اکٹھا کر کے اسی طرح اسی گوشت پوست میں انھیں احساسات اور ادراکات کے ساتھ اسی شکل وصورت میں پھر کھڑا کر سکتا ہے۔ اور موت کے بعد پھر میں آب وگل کے بطن سے برآمد ہو سکتا ہوں۔
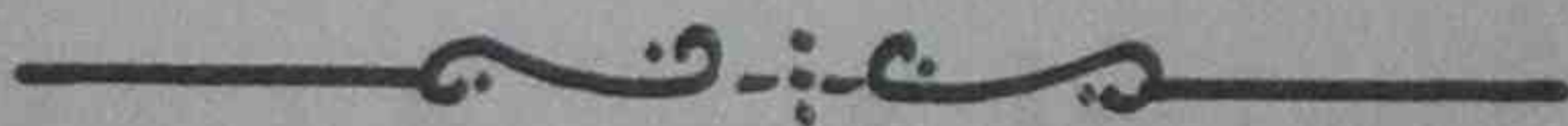
کارسازی

کتنی احمقانہ بات ہوگی؟

اگر میں ایک دانۂ سیب کو شاخ سے ٹوٹ کے زمین پر گرتے ہوئے دیکھ کے "کششِ ارضی" کا اقرار کرلوں لیکن ہزاروں سیب زہر مار کرنے کے بعد بھی اس رزّاقیت کا انکار کردوں جس نے ان خوش ذائقہ سیبوں میں شیرینی، خوشبو، لذّت، حیاتین (Vitamins) کا ذخیرہ بند کردیا ہے۔

کیسے ممکن ہے کہ اگر میری عقل یہ سوال اٹھائے کہ سیب ٹوٹ کے زمین پر کیوں گرا؟۔ تو میں اسکا جواب تلاش کرلوں اور جب عقل سوال کرے کہ "ان سیبوں میں مٹھاس کیوں ہے؟ یہ خوشبو کیوں پیدا کی گئی؟ یہ حیاتین اور پروٹین جو میرے جسم کی ضرورت ہیں کیوں اکٹھا کردی گئی ہیں؟۔ تو اسکا جواب ڈھونڈنے کے بجائے عقل کا دروازہ بند کرلوں۔

جس طرح ہر دانۂ سیب کششِ ارضی کی گواہی دے رہا ہے، اس سے کئی ہزار گنا زیادہ اعتماد و یقین کے ساتھ مجھے میرے رازق کی خبر دے رہا ہے۔

کتنا لایعنی کلام ہوگا اگر میں یہ تو کہوں کہ آجنتا اور اِلورا کے غاروں میں جامد اور بے جان نقاشی ماہر ترین فن کاروں کے عمل اور ارادے کا نتیجہ ہے مگر کائنات کی اتنی بڑی زندہ نقاشی کے پیچھے نہ کوئی ارادہ ہے نہ عمل؟۔

کیسی غیر معقول تضاد بیانی ہوگی؟ اگر میں کہوں کہ ملک کے مختلف شہروں

یں نظامِ فلکی کی علامتی نمائش گاہیں (جس یں چاند، سورج، زمین اور دوسرے سیاروں کی گردش دکھائی جاتی ہے) سائنس اور ریاضی کے ماہرین نے بڑی فن کاری سے تعمیر کی ہیں مگر آسمان میں گردش کرنے والے حقیقی سیاروں کا نظام بغیر کسی ارادے اور بغیر کسی حساب کے عالم وجود میں آگیا ہے۔

کتنی احمقانہ فکر ہوگی؟ اگر میں ایک کمپیوٹر مشین کو دیکھ کر اس کے بنانے والے کے دماغ کی تعریف کروں، مگر خود اس "دماغ" کو بنانے والے صانع کا انکار کر دوں۔

کیسی مہمل گفتگو ہوگی؟ اگر میں کہوں کہ ایک موٹر کار بغیر ڈرائیور کے نہیں چل سکتی، مگر کائنات کے اتنے بڑے کارخانے کے پیچھے کسی ارادے کی کار فرمائی نہیں ہے۔

نہ جانے کن آنکھوں سے دیکھا تھا روس کے اس سربراہ نے؟ جس نے اپنے سائنس دانوں کے کامیاب خلائی سفر کے اختتام پر بڑے غرور سے کہا تھا۔ "ہم چاند پر جا کے لوٹ آئے مگر ہمیں خدا نہ دکھائی دیا"۔

یہاں تو کہنا پڑتا ہے ؎

ہر جا تیری قدرت کے ہیں لاکھوں جلوے
حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں

مجھے تو ہر پھول میں اسی کی مہک اور ہر رنگ میں اسی کا جلوہ دکھائی

دیتا ہے ـــــ ہر قطرۂ باراں اور ہر ذرّۂ خاک، ہر برگِ شجر، ہر پارۂ سنگ، تمام اجرام و اجسام ارضی و سماوی "اس ابدی و ازلی" حکمت و ارادہ کی گواہی دے رہے ہیں ـــــ میں آخر اس کے کتنے گواہوں کا انکار کر دوں؟۔

جس طرح میں اپنے گرد و پیش پھیلی ہوئی روشنی کا ادراک کر رہا ہوں حالانکہ خود روشنی دکھائی نہیں دیتی۔ وہ دکھائی دینے والی چیز ہی نہیں بلکہ وہ دوسری چیزوں کو دکھائی دینے کے قابل بناتی ہے ـــــ کبھی آدھی رات کو شبِ ظلمت میں جب میں اوپر آسمان کی طرف نظر اُٹھاتا ہوں تو تا حدِّ نظر، تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے۔ حالانکہ "کرۂ ہوا" کے اوپر خلا میں خود ہمارے آفتاب کی روشنی موجود ہوتی ہے مگر ہماری نگاہیں اسے اپنی گرفت میں نہیں لے سکتیں۔

ـــــ اور جب چاند کا گولا فضا میں تیرتا ہوا ہماری "سرحدِ نظر" میں داخل ہو جاتا ہے تو وہ خود بھی روشن ہوتا ہے اور چاندنی کے ذریعے ہماری زمین کے ایک بڑے حصّے کو بھی روشن کر دیتا ہے ـــــ میں جانتا ہوں کہ یہ اس کی ذاتی روشنی نہیں ہے بلکہ یہ وہی آفتاب کی روشنی ہے جو پہلے سے فضا میں موجود تھی مگر میں محسوس نہیں کر رہا تھا۔ چاند سے ٹکرا کے اس کا انعکاس ہی اس کے ادراک کا سبب بنا۔ یعنی مجرّد روشنی محسوسات کی گرفت میں نہیں آتی ـــــ اسی طرح کائنات کی اس صنعت گری کے آئینے میں اس قدرتِ کاملہ کا ادراک کر رہا ہوں جو زمین و آسمان کی ازلی و ابدی روشنی ہے۔ ...

انکار ممکن نہیں

میں پورے ہوش وحواس سے ادراک کر رہا ہوں، میری بصیرت اور بصارت دیکھ رہی ہے، میرا منطقی شعور، چاند، سورج، ستاروں کی طرح، اپنے وجود کی طرح ادراک کر رہا ہے کہ اس کائنات کی پشت پر ایک ارادہ ہے جو اسے سنبھالے ہوئے ہے۔

ایک فیصلہ ہے جو اسے حرکت دے رہا ہے۔

ایک اصول ہے جو ذرّے ذرّے میں کارفرما ہے۔

ایک میزان و مقدار ہے جو ہر شے پر حاوی ہے۔

ایک نظم و ترتیب پوری کائنات کو گھیرے ہوئے ہے۔

ایک قدرتِ کاملہ سب کچھ اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔

ایک حکمتِ بالغہ ہر شے کو منظم کئے ہوئے ہے۔

ایک دانائی ہر جانب نگراں ہے۔

ایک "ربوبیت" ہے جو سب کو پال رہی ہے۔

ایک پروردگاری ہے جو سب کی پرورش کر رہی ہے۔

ایک رزاقیّت ہے جو اپنا خوانِ کرم بچھائے ہوئے ہے۔

ایک رحمتِ واسعہ ہر شے کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

اور اجرام ارضی و سماوی کا مجموعہ اپنے اس واحد نظام کی قسم کھا رہا ہے جس نے ایک ایک ذرّے کو اس طرح پرو رکھا ہے کہ زمین پر کوئی پتہّ ٹوٹتا ہے تو آسمان پر ستاروں کا دل دھڑکتا ہے۔

یہ عالمِ اسباب ہے۔ اور اسباب کی بامعنی کڑیاں عمل اور ردِّ عمل کا منطقی سلسلہ ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہے۔ ہر موجود کے ابتدا اور انتہا۔ دونوں سِرے اسی "وجود" پر منتہیٰ ہوتے ہیں جو ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔

جس کا وجود ہی اس کا ارادہ ہے۔

جس کا ارادہ ہی اس کی قدرت ہے۔

جس کی قدرت ہی اس کا علم ہے۔

جس کا علم ہی اس کا عدل ہے۔

جس کا عدل ہی اس کی رحمت ہے۔

جس کی رحمت ہی اس کا جبروت ہے۔

جس کا جبروت ہی اس کا جلال ہے۔

جس کا جلال ہی اس کی حکمت ہے۔

جس کی حکمت ہی اس کی سلطنت ہے۔

ہر وجود اس کے وجود میں محدود ہے۔ ہر ذات اس کی ذات سے گھری ہوئی ہے، اس کے لئے نہ کوئی حد ہے نہ احاطہ، اس کے لئے نہ زمان ہے نہ مکان وہ کبھی وجود میں نہیں آیا ہے بلکہ ہر شے کو وجود بخشنے والا "موجود" ہے۔

وہ زندہ نہیں ہوا ہے، بلکہ ہر شے کو زندگی عطا کرنے والی لامحدود زندگی ہے۔
وہ ازلی اور ابدی "حقیقت" ہے، وہ طلوع نہیں ہوا کہ غروب ہو جائے
وہ پیدا نہیں ہوا ہے کہ فنا ہو جائے، وہ بنا نہیں ہے کہ بگڑ جائے۔
وہ دانائی، حکمت، علم اور ارادہ ہے، جس کے لئے نہ ابعاد ہیں نہ
حدود، نہ جگہ گھیرتا ہے نہ جگہ چھوڑتا ہے، نہ آتا ہے نہ جاتا ہے، ہے وہ
ہر آگے سے آگے، ہر پیچھے سے پیچھے، ہر پہلے سے پہلے، ہر بعد سے بعد۔
وہ لامحدود ذات جس کے لئے نہ دائرہ ہے نہ مرکز، ہر جگہ اس کی حکومت
ہے اور ہر ذرّہ اس کا تختِ حکومت۔
میں اس کی ہمہ گیر ربوبیت، بے کراں علم، لامحدود قدرت اور ناقابلِ
شکست فیصلوں کا ادراک تو کر رہا ہوں، اسے رگِ جان سے زیادہ قریب
محسوس تو کر رہا ہوں مگر اس عظیم وجود کو اپنے تصوّر کی گرفت میں نہیں
لے سکتا، میرا دماغ اس کا احصاء نہیں کر سکتا۔
میں اس کی کمزور مخلوق۔ میرے اندر تو اتنی طاقت بھی نہیں کہ اس
کی پیدا کی ہوئی اس کائنات ہی کو اپنے تصوّرات کی گرفت میں لے لوں۔
تصوّر کرنا چاہتا ہوں تو طائرِ فکر کے پَر جلنے لگتے ہیں۔
تقریباً ایک سو ہزار ملین یعنی (ایک ہزار × ۱۰ × ۱۰ × دس لاکھ)
ستارے میرے سر پر گردش کر رہے ہیں۔ ایک کہکشاں سے دوسری
کہکشاں کا درمیانی فاصلہ ۸۵۰ ہزار "نوری سال" ہے ــــ نوری سال

کا مطلب ایک سال میں روشنی کا طے کیا ہوا فاصلہ۔ جبکہ روشنی کی رفتار (۳۰۰,۰۰۰) تین سو ہزار کیلومیٹر فی سکنڈ ہے، ___ اور ایک کہکشاں کا قطر یعنی دائرے کی درمیانی مسافت ۲۰ ہزار نوری سال ہے، یعنی (۳۶۵ x ۲۴ x ۶۰ x ۶۰ x ۳۰۰,۰۰۰ x ۲۰,۰۰۰) کس کے دماغ میں یہ طاقت ہے کہ اس کائنات کی وسعت کا تصوّر بھی کرے بینائی کی بات ہی کیا ہے تخیّل بھی، اس کی مقدار و شمار اور حدود کا احاطہ نہیں کر سکتا ___ تو پھر اس ذاتِ لامحدود کا تصوّر ایک دماغ کیسے کر سکتا ہے۔

زمین و آسمان کی کسی شے کی مثال دے کر بھی اسے نہیں سمجھا جا سکتا اس لئے کہ مخلوق خالق کی مثال نہیں بن سکتی۔ اس کے وجود کی دلیل خود اس کا وجود ہے۔

میں کائنات کے ایک ایک ذرّے میں اس علم و ربوبیت اس حکمت و قدرت کا مشاہدہ کر رہا ہوں۔ کیسی مہمل گفتگو ہوگی، اگر میں کہوں کہ "ربوبیت" تو ہے مگر کوئی رب نہیں، پروردگاری تو ہے مگر کوئی پروردگار نہیں۔ ارادہ تو ہے مگر کوئی مُرید نہیں، حکمت تو ہے مگر کوئی حکیم نہیں، ڈیزائن (Design) تو ہے مگر کوئی ڈیزائنر (Designer) نہیں ___؟ میں اسے رزاقیّت کہوں یا رزاق، پروردگاری کہوں یا پروردگار، علم کہوں یا عالم، ارادہ کہوں یا مُرید، بات ایک ہی ہے ___ صفت و موصوف کی حدبندیاں اور تعینات ہمارے لئے ہیں ___ وہاں جو ذات ہے وہی صفات۔

دنیا بھر کی زبانوں میں الفاظ کا جتنا بڑا ذخیرہ ہے وہ سب صرف ہو جائے مگر اس کی بے کرانی اور بے ہمتائی کے مفہوم کو سمیٹا نہیں جا سکتا۔

اس کے لئے اوپر نیچے، آگے پیچھے، دائیں بائیں کے سارے اشارے بے کار ہیں۔ وہاں نہ تمثیلیں کام آتی ہیں نہ کنائے۔ یہاں، وہاں، کہاں جیسے الفاظ اس کی بارگاہ میں بے مفہوم ہیں ؎

خضر کیسے بتائے، کیا بتائے
اگر ماہی کہے دریا کہاں ہے؟

مالک کی بارگاہ میں

وہی میرا مالک ہے۔ وہی ہر حال میں مجھے پالنے والا ہے۔ وہی مجھے اور میری طرح اس پوری کائنات کو پیدا کرنے والا ہے۔

وہ ہر سہارے کا سہارا، ہر سبب کا سبب ہے۔ باقی جو کچھ ہے سب اسباب کی کڑیاں ہیں۔ کوئی شے صرف اپنی ذات سے کافی نہیں، صرف وہی کافی ہے بس ــــ باقی سب محتاج ہیں، سب نیاز مند ہیں، سب ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں ہر وجود کسی دوسرے وجود پر ٹکا ہوا ہے۔ ہر وجود اپنی بقا کے لئے کسی دوسرے وجود کا متقاضی۔ ہے۔

ایک لقمہ روٹی بھی اناج کی محتاج، اناج زمین کا محتاج، زمین بادلوں کی محتاج، بادل سمندروں کے محتاج، سمندر سورج کے محتاج، سورج اپنی بھٹی میں جلنے والے ایندھن کا محتاج۔

آخر میں اپنا دستِ طلب کہاں، کہاں دراز کروں؟ کس کس؟ سے کرم کی بھیک مانگوں ــــ کس کس کی دہلیز پر جبینِ عقیدت جھکاؤں؟ سبھی میری طرح اس کی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ سب اس کے محتاج ہیں جس نے احتیاج و نیاز مندی کے رشتے میں سب کو جوڑ رکھا ہے۔

ــــ صرف وہی بے نیاز و بے ہمتا ہے، نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا ہے مگر اس

کی عطا کی ہوئی نعمتیں گواہی دے رہی ہیں کہ وہ بے نیازی کے باوجود بے اعتناء نہیں ہے، سب کی خبر گیری اور دست گیری کرنے والا ہے۔

صرف اسی کو حق حاصل ہے کہ سب کا ملجا و ماوٰی بنے۔ مصیبتوں میں اسی کو آواز دی جائے گی اور صرف اسی کے سامنے جبینِ شکر گذاری جھکائی جائے گی۔

عقل کہتی ہے اس کو آواز دوں۔ اسے پکاروں کیوں کہ اس کے علاوہ کوئی لائقِ پرستش نہیں، سب میری طرح محتاج ہیں۔ پھر ایک غلام دوسرے غلام کے آگے جبینِ نیاز کیوں خم کرے؟ ـــ اس کی سلطنت لازوال، اس کی حکومت لامحدود، اس کی رحمت بے انتہا۔ صرف اسی کو حق حاصل ہے کہ اس کی پرستش کی جائے۔

میرا وجود تقاضا کر رہا ہے کہ اس کے سامنے فروتنی و بندگی کا اظہار کروں، ـــ مگر اظہار کا طریقہ کون بتائے کہ جو اس کی مرضی کے مطابق ہو؟۔

میں اس کے سامنے اپنی پیشانی جھکانا چاہتا ہوں۔ ایک وفادار اور حق شناس غلام کی طرح۔ عقل کہتی ہے پرستش کا وہی طریقہ صحیح ہے جو وہ خود بتا دے، اپنی خواہشات یا قیاس سے عبادت کا کوئی طریقہ ایجاد کرنا جائز نہیں۔ یہ اس بارگاہِ جلالت میں گستاخی ہے۔

میں تنہائی میں بھی جب کوئی اچھا کام کرتا ہوں تو مجھے اطمینان و مسرت کا احساس کیوں ہوتا ہے؟ کیا میرا مالک مجھے اس کا انعام دے گا؟

اور اگر مجھ سے تنہائی میں بھی کوئی بُرا کام سرزد ہوتا ہے تو نقصان خوف وندامت کا احساس کیوں ہوتا ہے کیا میرا مالک مجھے سزا دے گا؟۔

کسی غلطی کے ارتکاب پر شرمندگی کے احساس کے ساتھ معذرت کا جذبہ کیوں بیدار ہوتا ہے؟ معافی مانگنے کا تصوّر کیوں پیدا ہوتا ہے۔ یہ آخر مجھے بے چینی کیوں ہوتی ہے؟ یہ عہد شکنی جیسا احساس کیوں پیدا ہوتا ہے؟ ضمیر کچوکے کیوں لگاتا ہے؟۔

کیا میں کسی عدالت کے سامنے کھڑا ہوں؟

میرا وجدان (Intuition) مجھے آواز دیتا ہے کہ یقیناً تیرے عمل کے ایک ایک ذرّے کی نگرانی ہو رہی ہے ۔ دیکھنے والا تجھے اندر سے بھی دیکھ رہا ہے اور باہر سے بھی۔ تیرے اعمال بھی اس کے سامنے ہیں اور تیرے خیالات بھی، تیری روح بھی اور تیرا جسم بھی۔

میں فیصلہ کرتا ہوں! کہ مجھے وہی کرنا چاہیے جو اس کی خوشنودی کا سبب ہو، ان کاموں سے بچنا چاہیئے جو اسے ناراض کرنے والے ہیں۔ اس کی مرضی کے بغیر ایک قدم بھی نہ اٹھاؤں۔ میں چاہتا ہوں کہ ایسے کام انجام دوں جو اس کی نعمتوں میں اضافے کا ذریعہ ہیں۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں میرا کوئی عمل اس کی جبینِ عظمت پر شکن نہ ڈال دے۔ کہیں میرا کوئی عمل اس کے غضب کو آواز نہ دے۔

اس کی رحمت کا احساس مجھ سے تقاضا کرتا ہے کہ خود کو اس کے

سامنے ڈال دوں۔ اس کی بندہ پروری مطالبہ کرتی ہے کہ خود کو اس کے حوالے کر دوں۔

مگر کون بتائے کہ وہ مجھ سے کیا چاہتا ہے ؟۔

کس سے پوچھوں کہ اس کا شکریہ کیسے ادا کیا جائے ؟

میں اسے کیا کہہ کے پکاروں ؟ اسے کس نام سے آواز دوں ؟

وہ مجھ سے میرے عمل کا حساب کب اور کیسے لے گا ؟

مجھے نیکیوں کی جزا اور برائیوں کی سزا کیسے ملے گی ؟

کیا وہ مجھے پیدا کرنے کے بعد پھر عدم کے حوالے کر دے گا ؟

کیا موت ہمیشہ کے لئے معدوم ہو جانے کا نام ہے ؟

میرا وجود اس طرح کے سیکڑوں سوالات کے جواب مانگ رہا ہے۔

مگر "عقل" کہتی ہے کہ میں اس کے وجود کا ادراک اور اس کی عظمتوں کو محسوس تو کرتی ہوں مگر وہ کیا چاہتا ہے اس کا قطعی اور تفصیلی جواب دینا میرے بس میں نہیں ہے۔

ہدایت کی ضرورت

میں اس کی مرضی کا پتہ لگانے کے لئے عالم حیات پر نظر ڈالتا ہوں۔ فطرت کی انگلی تھام کے کچھ دور تک چلتا ہوں۔ مگر پھر راستہ مسدود ہو جاتا ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ کدھر جاؤں؟۔

میں طائروں اور چوپایوں کو دیکھتا ہوں کہ وہ فطرت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے چلے جا رہے ہیں، اپنے ارادہ و اختیار سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتے۔ مگر مجھے فطرت کی کھلی فضا میں سانس لینے کی آزادی عطا کی گئی ہے۔ میری فطرت کے تقاضوں کی مہار میرے ارادہ و اختیار کے ہاتھوں میں پکڑا دی گئی ہے۔ اور میرے ارادۂ و اختیار پر عقل و شعور کی حکمرانی قائم کر دی گئی ہے۔

عقل و شعور یہ تو بتاتے ہیں کہ مجھے اسی طرح زندگی گذارنا چاہیئے جس طرح میرا مالک چاہتا ہے، وہی کرنا چاہیئے جو اسے پسند ہے مگر اس کی پسند و ناپسند، رضامندی و ناراضگی کی تفصیل نہیں بتا سکتے۔

میرا منطقی شعور کچھ دور تک میری رہنمائی کرتا ہے مگر پھر تھک کے بیٹھ جاتا ہے۔ اور آواز دیتا ہے کہ آگے کا سفر میرے بس میں نہیں کسی ایسے مرکز علم کو تلاش کر جو تجھے تیرے مالک کی مرضی سے آگاہ کر سکے، تجھے تیرا وظیفۂ عمل

بتا سکے۔

"وجدان"۔۔۔ میری رہنمائی بھی کرتا ہے، مجھے راستہ بھی بتاتا ہے، کسی حد تک اچھائی اور برائی، نیکی اور بدی کی نشاندہی بھی کرتا ہے۔ مگر منزل تک پہونچانے سے قاصر ہے، صحیح اور غلط کی پوری تفصیل بتانے سے معذور ہے۔

عقل و شعور و وجدان۔۔۔ کچھ دور رہنمائی کے بعد آواز دیتے ہیں کہ اب اس کے آگے ہمیں کچھ نہیں دکھائی دیتا۔۔۔ اندازوں سے قدم بڑھانے میں ہلاکت کا خطرہ ہے۔۔۔ بغیر "ہدایت نامہ" کے آگے سفر ممکن نہیں۔

اگر کچھ اعمال ہر حالت اور ہر مقدار میں صرف اچھے ہوتے اور کچھ اعمال ہر حالت اور ہر مقدار میں صرف بُرے ہوتے، اگر کچھ چیزیں صد فی صد مفید ہوتیں اور کچھ چیزیں صد فی صد مضر ہوتیں۔۔۔ تو میری عقل آسانی سے "ترک و اختیار" کا فیصلہ کر لیتی مگر یہاں تو کوئی چیز بُری نہیں، فطرت کا کوئی تقاضا غلط نہیں،۔۔۔ جو کچھ اس نے پیدا کیا ہے سب مفید اور بہتر ہے۔۔۔ افراط و تفریط، اور غلط استعمال کے ذریعہ بُرائیاں جنم لیتی ہیں۔ ہر شے اپنی صحیح مقدار میں تریاق ہے، مقدار میں کمی بیشی اسے زہر بنا دیتی ہے۔ آگ سے گھر روشن بھی کئے جا سکتے ہیں اور جلائے بھی جا سکتے ہیں۔ چھُری سے سبزیاں بھی کاٹی جا سکتی ہیں اور گلے بھی۔

میری عقل اس یقین کے ساتھ تمام اچھائیوں اور بُرائیوں کی نشاندہی

نہیں کرسکتی کہ مجھ پر حجت تمام ہو جائے اور مالک کی رضامندی اور خوشنودی کا ناقابلِ انکار علم حاصل ہو جائے۔

میں ماں کے پیٹ سے علم لے کر پیدا نہیں ہوا ہوں۔ ٹھوکر لگنے کے بعد راستے کے پتھر کا پتہ چلتا ہے ــــ ہو سکتا ہے کہ جب پتہ چلے تو پاؤں زخمی ہو چکے ہوں ــــ ہو سکتا ہے کہ میں سنگِ راہ کو سنگِ میل اور سنگِ میل کو سنگِ راہ سمجھ کے ٹھوکریں کھاتا رہوں ــــ زہر ہلاہل کو آبِ حیات سمجھ کے نوشِ جان کر جاؤں۔ اس لئے کہ "لذتِ کام و دہن" کو "رگ و پے" میں اترنے والے زہر کا اندازہ کہاں؟ ان تجربوں سے کیا حاصل جو قبر میں پہونچنے کے بعد ہوں۔

میری عقل مجھے آگاہ کرتی ہے کہ کسی مخلوق کی جان نہ لوں ان پر تشدّد نہ کروں۔ میرا یہ عمل ان کے اور مجھے پیدا کرنے والے کی ناراضگی کا سبب بن سکتا ہے ــــ تو کیا میں سانس لینا چھوڑ دوں؟ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ ان ہواؤں میں نہ دکھائی دینے والے جاندار، اللہ کی بے شمار مخلوقات زندگی گذار رہے ہیں ــــ یہ پانی، جس میں لاتعداد زندگیاں تیر رہی ہیں۔ یہ بھی تو اسی عظیم طاقت کے زائیدہ و پروردہ ہیں جس نے مجھے پیکرِ وجود عطا کیا ہے۔ مجھے کیا حق ہے کہ میں ان کی موت سے اپنی زندگی کا سامان کروں؟۔

میرا وجدان مجھے حکم دیتا ہے کہ اپنے پیٹ کی آگ بجھاؤں، مگر کس

چیز ہے ؟ دودھ، دہی، گوشت وغیرہ کیسے استعمال کروں ؟ یہ اس کی مخلوق پر تشدّد اور زیادتی کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے۔

یہ نباتات، یہ پودے، یہ اناج یہ بھی تو بے جان نہیں ہیں ـــ بس فرق اتنا ہے کہ جب میں انھیں اپنی غذا بناتا ہوں، انھیں استعمال کرتا ہوں تو وہ فریاد نہیں کرتے! احتجاج نہیں کرتے یا کون جانے؟ اپنی زبان میں فریاد بھی کرتے ہوں۔ احتجاج بھی کرتے ہوں، مگر میری سماعت ہی انھیں سننے سے قاصر ہے۔!

میری عقل مجھے آگاہ کرتی ہے کہ کھانے پینے کا منطقی حق حاصل کرنے کے لئے اس مالک کا اجازت نامہ ضروری ہے جس نے مجھے بھی پیدا کیا ہے اور انھیں بھی جنھیں میں بطورِ غذا استعمال کرتا ہوں۔ تاکہ اس کی بارگاہ میں بری الذّمہ ہو سکوں اور دنیا میں اطمینانِ نفس حاصل ہو سکے۔...

"کدھر جاؤں میں"

میرے سامنے مخلوقات کی بے شمار قسمیں پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کے طرزِ حیات سے میں کوئی سبق نہیں حاصل کر سکتا، کیونکہ وہ مختلف قسموں میں بٹی ہوئی ہیں، ان کا طرزِ حیات ایک دوسرے سے مختلف ہے۔

کچھ تنہائی پسند ہیں، اکیلے زندگی گذارتے ہیں اور اکیلے مر لیتے ہیں نہ گھر، نہ خاندان، نہ گروہ، نہ سوسائٹی، نہ دوست، نہ ساتھی، نہ باہمی تعاون' نہ آئندہ کے لئے ذخیرہ اندوزی، نہ خانہ سازی، نہ بچوں کی پرورش۔ جب بھوک لگی غذا تلاش کر کے پیٹ کی آگ بجھائی اور آگے بڑھ لئے۔ جنسی اشتہا پیدا ہوئی تو صنفِ مقابل کے جسم سے نکلنے والی بُو یا دعوتِ وصل دینے والی آوازوں کے سہارے انھیں ڈھونڈ کے اپنا کام نکالا اور بغیر ایک دوسرے کا شکریہ ادا کئے اپنا راستہ لیا۔ جہاں گوشہ تنہائی ملا آرام کر لیا، ضرورت پڑی تو اپنی ہی اولاد کو بطور غذا استعمال کر گئے۔ جیسے سانپ، بچھو، اور دوسرے حشرات الارض وغیرہ۔

کچھ گروہ پسند ہیں، انھیں تنہائی گوارہ نہیں، ایک ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں، جھنڈ بنا کر رہتے ہیں، ایک دوسرے سے تعاون کرتے ہیں۔ اپنے گروہ کے اراکین سے بیوفائی نہیں کرتے مگر جنسی آزادی پر کاربند

ہیں ، سب ، سب کے لئے کوئی کسی کے لئے مخصوص نہیں ، بچّوں کی پرورش تنہا مادہ کی ذمہ داری ہے "نر" کو ہاتھ بٹانا گوارہ نہیں ، جیسے متعدّد چوپائے کتّے بندر وغیرہ ۔

کچھ ازدواج پسند ہیں ، عائلی زندگی گذارنے کے عادی ہیں ۔ بہت سختی سے اپنے ازدواجی رشتے کی پابندی کرتے ہیں ۔ ایجاب وقبول کے بغیر ایک دوسرے کے وفادار رہتے ہیں ۔ جنسی آسودگی حاصل کرنے کے لئے اپنے ساتھی کے علاوہ دوسری طرف دیکھنا بھی گوارہ نہیں کرتے ۔ دوسروں کے آشیانوں میں تاکنا جھانکنا قطعاً پسند نہیں کرتے ۔ بچّوں کی پرورش اور قیام گاہ کی تعمیر میں نر و مادہ برابر کے شریک رہتے ہیں ، جیسے طائروں کی متعدّد قسمیں ۔

کچھ تنظیم پسند ہیں ، یہ طبقہ انتہائی مضبوط و مستحکم اجتماعی نظام کے تحت زندگی گذارتا ہے ، ذاتی مفاد سے بلند ہو کر مشترکہ مفاد کے لیے خود کو وقف کر کے اپنی معیّن ذمّہ داریاں پوری کرتا ہے ، ان کے لئے اپنی جان دے دینا آسان ہے مگر اپنے فرائض سے فرار ممکن نہیں ۔

یہ اپنے امیر کے اطاعت گذار اور مشترکہ سرمایے کے محافظ ہوتے ہیں ، نہ ان کی ذاتی ملکیت ہوتی ہے نہ ضرورت ، نہ اولاد نہ ساتھی ، سب کچھ جماعت کا ہے ، فرد کی کوئی حیثیت نہیں ، انسانوں کے بنائے ہوئے سیکڑوں اشتراکی نظام ان کی اشتراکیت پسندی پر قربان کئے جا سکتے

ہیں ۔ جیسے شہد کی مکھیاں، دیمک، چیونٹی وغیرہ۔

اب میں اپنے جیسے انسانوں پر نظر ڈالتا ہوں، جو اتنا عظیم الخلقت ہے کہ تمام مخلوقات پر اپنا اقتدار جما چکا ہے اور تمام حیوانات کو اپنے زیرِ تصرف لا چکا ہے ۔ آخر خود اس کے لئے کون سا طریقۂ حیات معیّن کیا گیا ہے ؟

اگر یہ تنہائی پسند ہے تو اسے زندہ رہنے کے لئے سماج کی ضرورت کیوں ہے ؟ اگر یہ سماجی جاندار ہے تو پھر اپنے جیسے دوسرے انسانوں کو قتل کر کے سماج سے بغاوت کیوں کرتا ہے ؟

اگر یہ گروہ پسند ہے تو گروہ سے غدّاری کیوں کرتا ہے ؟

اگر یہ ازدواج پسند ہے تو دوسروں کے جنسی رشتوں پر دست درازی کیوں کرتا ہے ؟ عمر بھر تاکنے جھانکنے کی عادت کیوں باقی رہتی ہے ؟ اپنے "آرٹ" ثقافت، ادب اور شاعری میں جنسی لاقانونیت کا مظاہرہ کیوں کرتا ہے؟

اگر جنسی آزادی اس کی فطرت ہے تو جب کوئی دوسرا اس کی شریک حیات پر بُری نظر ڈالتا ہے تو مرنے مارنے پر کیوں آمادہ ہو جاتا ہے ؟ غیرت و حمیّت کے جذبے سے مغلوب ہو کے اپنی جان تک کیوں دے دیتا ہے ؟۔

اگر یہ تنظیم پسند ہے تو اجتماعی قوانین کی پابندی کیوں نہیں کرتا؟ تنظیمی پابندیوں سے فرار کیوں اختیار کرتا ہے۔؟

آخر یہ کس خانے کا جانور ہے ؟

مذکورہ حیوانات تو مجبور کر دیئے گئے ہیں وہ اپنی فطرت کے بتائے

ہوئے طریقۂ حیات سے ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں ہو سکتے۔

مگر یہ حیوانِ عجیب ہر طرح زندگی گذارنا چاہتا ہے ۔ آخر کیوں ؟

مجھے وہ ہپّی بھی نظر آتے ہیں جو خاندانی اور سماجی رشتوں کو توڑ کے آزاد کیڑوں مکوڑوں کی طرح زندہ رہنے کی کوشش میں مشغول ہیں، تہذیب وثقافت کے تمام قوانین ان کے لئے بے مفہوم ہیں۔

وہ قنوطی افراد بھی سامنے ہیں جو "ترک دنیا کی گپھاؤں" میں سر چھپا کے زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔

وہ رجائی بھی دکھائی دیتے ہیں جو ہر شے کو غرقِ مۓ ناب کر دینا چاہتے ہیں۔

وہ "عالم دوبارہ نیست" کا نعرہ لگانے والا طبقہ بھی نظر آتا ہے، جو لذّت پرستی کو مقصدِ حیات سمجھتا ہے۔

وہ ترقی پسند طبقہ بھی دکھائی دیتا ہے جو جنسی آزادی کے ساتھ عائلی زندگی بسر کرنے کی کوشش میں مصروف ہے۔

مشترک ازدواج اور مشترک اولاد کے راستے پر چلنے کا تجربہ کرنے والے بھی موجود ہیں۔

ہم جنسی اور خود کاری کو اپنا انسانی حق بتانے والے بھی دکھائی دیتے ہیں جو شاہد و مشہود میں کسی امتیاز کے قائل نہیں اور ایسے مصنوعی راستے بنانے کی کوشش کر رہے ہیں جن سے گذرنا کسی جانور کو بھی گوارہ نہیں۔

مجھے فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ انسان کو فطرت کے تقاضے تو دیئے گئے ہیں مگر زنجیر ڈھیل کر دی گئی ہے تاکہ وہ اپنے ارادۂ اختیار سے اپنے حلقۂ آزادی میں حرکت کر سکے اور اپنے اچھے بُرے اعمال کا ذمّہ دار بن سکے۔

یہ بے راہ روی اور بے سمتی اسی اختیار کے غلط استعمال کا نتیجہ ہے۔ اور اس کا صحیح استعمال اس کے علاوہ کچھ نہیں کہ وہ مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔

یہ ممکن نہیں کہ وہ لامحدود و لامتناہی طاقت، جس نے ہر ذرّے کے سینے میں بھی ایک مضبوط حکیمانہ نظام قائم کر رکھا ہے۔ اتنا غیر حکیمانہ عمل انجام دے کہ اپنی سب سے برتر مخلوق کو ارادہ و اختیار دے کے خواہشات کے اندھے طوفانوں کے حوالے کر دے بغیر ہدایت کے "بابِ قفس" کھول دینے کا نتیجہ ہلاکت کے سوا کچھ نہیں، جبکہ ہر موجِ نفس میں سیکڑوں تباہیوں کے دہانے کھلے ہیں۔

نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔

مجھے یقین ہے کہ اپنی تمام مخلوقات کے لئے ایک مخصوص طرزِ زندگی معیّن کرنے والے نے میرے لئے بھی کوئی طریقۂ حیات ضرور معیّن کیا ہے۔ جس کی پابندی کر کے میں اپنے وجود کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکتا ہوں۔

مگر وہ طریقۂ حیات کیا ہے؟

عقل کے علاوہ مجھے ایک ایسا ذریعہ بھی درکار ہے، جس سے میں اپنے مالک کا اجازت نامہ حاصل کر سکوں، جو مجھے میرے مالک کی طرف سے میری ذمہ داریاں بتا سکے"...

قانونِ حیات

میں ایک سماجی مخلوق ہوں۔ زندگی گذارنے کے لئے مجھے ایک معاشرہ چاہیئے۔

اور معاشرہ بغیر قانون کے نہیں تشکیل دیا جا سکتا۔ سماج بغیر دستور کے وجود میں نہیں لایا جا سکتا۔ یعنی مجھے بحیثیت انسان زندہ رہنے کے لئے ایک ضابطۂ حیات درکار ہے۔ ایک ایسا ضابطۂ حیات، ایک ایسا دستورِ زندگی جس کے تحت میرے جیسے تمام انسان آسانی سے زندگی گذار سکیں ایک ایسا قانونِ حیات جو ایک ایسے عادلانہ نظامِ معاشرت و معیشت کو جنم دے سکے جو پورے عالمِ انسانیّت کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو تاکہ اس میں قدم رکھنے والے ہر انسان کی صلاحیتیں برابر سے نشو و نما پا سکیں، ایک ایسا قانون جو فرائض و حقوق کی فہرست بھی بتائے اور ان کی حفاظت کا طریقہ بھی۔

جس طرح مجھے سانس لینے کے لئے ہوا، پیاس بجھانے کے لئے پانی اور بھوک مٹانے کے لئے غذا کی ضرورت ہے اور میں ان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا، ٹھیک اسی طرح مجھے بحیثیت انسان زندہ رہنے کے لئے ایک قانون کی ضرورت ہے۔ بغیر کسی قانون کے زندہ رہنے والا یا جانور

ہو گا یا پاگل ـــــ باہوش انسان نہیں۔

مجھے یہ قانون کون دے؟ یہ دستورِ حیات کہاں سے حاصل کروں؟

کیا میں کائنات میں جاری علت و معلول کے بنیادی اصول کا بغور مطالعہ کر کے اپنی عقل اور وجدان کے سہارے اپنے لئے خود ہی ایک قانون وضع کر لوں؟ خود ہی ایک دستورِ حیات ترتیب دے کے اس کے تحت زندگی گذار لوں؟ مگر اس طرح تو میرے جیسے ہر انسان کو حق حاصل ہو گا کہ وہ اپنی ذات کے لئے اپنا قانون بنالے۔ جس کا نتیجہ لاقانونیت اور "جنگل راج" کی شکل میں ظاہر ہو گا۔ اس طرح معاشرے کی تشکیل ممکن نہیں۔

دوسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ دنیا کے تمام انسان مل کے قانونِ حیات وضع کر لیں اور اپنے لئے مشترکہ دستورِ حیات بنالیں جس کی پابندی سب کریں۔ ـــــ مگر کرۂ ارض کے تمام انسانوں کو ایک جگہ جمع کرنا کہاں ممکن ہے؟۔

تیسری صورت یہ ہو سکتی ہے کہ کچھ تھوڑے سے انسان تمام انسانوں کی نمائندگی کریں اور یہ عوامی نمائندے کثرتِ رائے کی بنیاد پر قانون بنالیں، مگر یہ طریقہ اختیار کرنے پر بھی میری عقل راضی نہیں۔ کیونکہ ـــــ یہ عوامی نمائندے جو خود اپنی زندگی کے تقاضوں سے ناواقف ہوں، وہ ایسا قانون کیسے تشکیل دے سکتے ہیں جو اربوں انسانوں کی ضرورت پوری کر کے پُرامن معاشرے کی ضمانت دے سکیں۔

سب اپنے مزاج اور طبائع کے مطابق قانون بنانے کی کوشش کریں گے

اس لئے اتفاقِ رائے ممکن نہیں۔

سمندروں کے کنارے زندگی گذارنے والوں کو کیسے احساس ہوسکتا ہے کہ پہاڑوں کی بلندیوں پر رہنے والوں کی ضرورت کیا ہے؟۔

اکثریت کے فیصلے کو معیار بنانے کی صورت میں اقلیت اس کی پابندی کیوں کرے؟

وہ بچّے جو ابھی بالغ نہیں ہوئے یا جو شکمِ مادر میں پرورش پا رہے ہیں، ان کی نمائندگی کون کرے گا اور بالغ ہونے کے بعد انھیں قانون شکنی سے روکنے کی منطقی توجیہہ کیا ہوگی؟

ہر زمانے اور ہر علاقے کے تقاضے الگ ہوتے ہیں ایسی صورت میں مشترکہ قانون کی افادیت کا قطعی ثبوت کیا ہوگا۔

اگر ہر علاقے اور ہر زمانے کے لئے الگ الگ قانون بنایا جائے جیسا کہ اکثر علماءِ عمرانیات کی رائے ہے تو ایک علاقہ اور ایک زمانہ کہاں تک ہوگا؟ — زمانوں اور علاقوں کی حدیں کس معقول بنیاد پر قائم کی جائیں گی؟ یعنی اگر ایک صدی کو ایک زمانہ تصوّر کیا جاسکتا ہے تو ایک سال بلکہ ایک دن کو ایک زمانہ کیوں نہیں کہا جاسکتا اور اسی طرح اگر دس ہزار خاندانوں پر مشتمل بستی کو ایک علاقہ تسلیم کیا جاسکتا ہے تو ہر خاندان بلکہ ہر فرد کو ایک الگ علاقہ کیوں نہیں مانا جاسکتا؟ — زندگی کے تقاضے تو ہر قدم پر اور ہر لمحہ بدلتے رہتے ہیں۔ اگر حیات کے ضابطے بھی یوں ہی بدلتے رہے تو بے ضابطگی اور لاقانونیت کا کیا

مطلب ہے ؟۔

انسان کے سامنے اس کا ماضی تو ہے مگر مستقبل نگاہوں سے اوجھل ہے اور قانون کی ضرورت ماضی کے لئے نہیں بلکہ مستقبل کے لئے ہے۔ پھر جو ہمارے سامنے نہیں ہے اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا ہمیں کیا حق ہے ؟۔

ساری دنیا میں "قانون ساز" مجلسیں قائم ہیں جو اپنے اپنے ممالک کے لئے قانون بناتی ہیں مگر خود وہاں کے عوام اپنے ہی نمائندوں کے بنائے ہوئے قانون کے خلاف احتجاج اور بغاوت کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ قانون بنتے ہیں پھر قانون شکنی ہوتی ہے کتنے ہی قوانین نفاذ سے پہلے ہی مسترد کر دیئے جاتے ہیں۔ قانون کے خلاف قانون بنائے جاتے ہیں۔

اس کا کھلا ہوا مطلب ہے کہ انسان کا بنایا ہوا قانون انسان کو مطمئن نہیں کر سکتا شاید ہی کوئی ایسا ملک ہو جہاں کے کچھ علاقے الگ ہونے کی کوشش میں نہ مصروف ہوں خود مختاری کی جدوجہد نہ کر رہے ہوں ــــ علیحدگی پسندی کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ وہ زمین کا ایک ٹکڑا کاٹ کے کہیں اور لے جائیں گے ؟ اس کا مطلب ہے کہ وہ اپنے لئے الگ قانون چاہتے ہیں۔

جب بھی کہیں کوئی قانون بنتا ہے، اس کے خلاف احتجاج بھی شروع ہو جاتا ہے، حزب مخالف عالم وجود میں آتا ہے۔ ٹکراؤ ہوتا ہے اور کشت و خون کا بازار گرم ہو جاتا ہے ــــ ارسطو کی جمہوریت سے لے کر کارل مارکس کی اشتراکیت تک کی تاریخ گواہ ہے کہ انسانوں کی "قانون سازی" نے انسانیت

کو کوئی فائدہ نہیں پہونچایا ہے۔

کسی کو کیا حق ہے کہ اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے لئے قانون بنائے؟ ایک عہد دوسرے عہد کے لئے قانون سازی کرے؟ ایک علاقہ دوسرے علاقے کے لئے دستور ترتیب دے؟۔

انسانوں کو ایک ایسا قانونِ حیات چاہیئے، جو پورے کرۂ ارض پر لاگو کیا جاسکے۔ ہر دور اور ہر علاقہ کا انسان برابر سے اس کا احترام کرنے پر مجبور ہو، ہر انسان اس سے محبت کرسکے اور برابر کا جذباتی تعلق رکھتا ہو۔

میری عقل اور میرا منطقی شعور، چیخ چیخ کے آواز دیتے ہیں کہ ایسا قانون صرف وہی بناسکتا ہے جس نے اس کائنات کی تخلیق کی ہے۔ قانون سازی کا حق صرف اسی عظیم طاقت کو حاصل ہونا چاہیئے جس نے مجھے اور میرے جیسے تمام انسانوں کو پیدا کیا ہے جو زندگی کے ان تقاضوں سے بھی واقف ہے جو ابھی سامنے نہیں آئے۔ جس کی ذات زمان و مکان کی قید سے بالاتر ہے۔ جو رگِ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جس کے سامنے ہر ذرہ بے نقاب اور ہر جذبہ بے حجاب ہے۔ جو سمتوں، سرحدوں، جذبات و خواہشات کی جانب داری سے منزّہ اور مبرّا ہے۔ جو خالق و رب ہونے کی حیثیت سے تمام انسانوں سے برابر کا تعلق رکھتا ہے۔

زندگی بسر کرنے کے لئے مجھے اسی کا بنایا ہوا قانون چاہیئے جو میرا مالک ہے مجھے پیدا کرنے والا ہے، میرے وجود کے تقاضوں سے مجھ سے زیادہ واقف ہے۔

•••

تلاش

عقل کہتی ہے کہ جادۂ حیات میں قدم بڑھانے سے پہلے اس مالک کی اجازت ضروری ہے اس لئے کہ غلام کا کوئی عمل آقا کی رضامندی کے بغیر عقلاً صحیح نہیں ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ مجھ سے راضی رہے میری تمنّا ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے ــ مگر مجھے نہیں معلوم کہ وہ کس عمل سے راضی اور کس عمل سے ناراض ہوگا۔؟

کائنات کا ہر ذرّہ اس کے جلال و جبروت اور اس کے فضل و رحمت کی گواہی تو دے رہا ہے مگر اس کا حکم بتلانے کے لئے تیار نہیں۔

آخر میں اس کا پیغام کہاں سے حاصل کروں؟

اس کا اجازت نامہ کس سے مانگوں؟

اس کا حکم کون بتائے؟

میں عقل و وجدان کے قطعی فیصلوں کو اپنے مالک کا حکم سمجھتا ہوں مگر عقل و وجدان آواز دیتے ہیں کہ یہ معنویات روحانیات کی دنیا ہے یہاں تجربہ کام آتا ہے نہ مشاہدہ، یہاں ہم قطعی اور یقینی فیصلہ کرنے کی صلاحیت سے محروم ہیں ــ مگر گھبرانے اور مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

ممکن نہیں کہ وہ رحیم و کریم، قدرتِ کاملہ و رحمتِ واسعہ پیدا کرنے کے بعد تجھے لاوارث چھوڑ دے، تو فطرت کے تاریک صحرا میں ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہے ـــ زندگی دی ہے تو قانونِ زندگی بھیجا ہوگا۔ حیات عطا کی ہے تو دستورِ حیات بھی مرحمت فرمایا ہوگا۔

جس نے تجھے دنیا میں بھیجنے سے پہلے شیرِ مادر کی شکل میں غذا فراہم کر دی تھی، پیاس کا تقاضا ابھارنے سے پہلے پانی پیدا کر دیا تھا، بھوک لگنے سے پہلے غذا فراہم کر دی تھی ـــ کیسے ہو سکتا کہ زندگی کے بارے میں وہ ہدایت نامہ نہ بھیجا ہو جس کے بغیر زندہ رہنا ممکن نہیں۔ اپنی رضامندی اور ناراضگی کی فہرست نہ بھیجی ہو جس کے بغیر عمل ہلاکت کا سبب ہے۔

انسان بنانے کا تقاضا ہے کہ عقل و شعور کا مالک بنائے اور عقل و شعور عطا کرنے کا لازمہ ہے کہ ارادہ اختیار کی آزادی دی جائے اور ارادہ و اختیار کی آزادی کا تقاضا ہے کہ الگ سے ہدایت کی جائے یعنی اب صرف تکوینی ہدایت سے کام نہیں چلنے والا ہے بلکہ ترسیلی ہدایت ضروری ہے۔

کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں اس کا پیغام محفوظ ہوگا۔ تلاش کرنا تیرا کام، ڈھونڈنا تیری ذمہ داری ہے۔

اب میں اس پیاسے کی طرح جو پانی کے وجود کے یقین کے ساتھ سرگرداں ہو ـــ اپنے قدم آگے بڑھاتا ہوں۔ راستے کے پیچ و خم کے باوجود منزل کا یقین لئے۔

میں فلسفیوں سے پوچھتا ہوں، بھائی! کیا تمھارے پاس مجھے پیدا کرنے والے مالک کا کوئی پیغام ہے؟ کوئی ہدایت نامہ ہے؟ مجھے جواب ملتا ہے، نہیں، ہمارے پاس اس کا پیغام تو نہیں ہے مگر اس کی ذات و صفات کے بارے میں خود ہمارے اپنے خیالات ہیں انھیں ہم سے حاصل کرلو! میں جواب دیتا ہوں کہ مجھے تمہارے خیالات نہیں اپنے مالک کا حکم چاہیئے۔

میں سائنس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہوں اور سوال کرتا ہوں ——

سائنس دانو! کیا تمھاری تحقیقات کے دامن میں اس ازلی وابدی طاقت کا کوئی ہدایت نامہ بھی ہے جس نے تمام توانائیوں کو پیدا کیا ہے۔

علمائے سائنس جواب دیتے ہیں ہمارے پاس عالم محسوسات سے آگے کا علم نہیں۔ ہم طبعیات سے اوپر دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہیں۔ ہم مادّیات کی چہار دیواری سے باہر نہیں نکل سکتے۔

دھیان سے گیان حاصل کرنے والے رشیوں بھگتوں، مہاتماؤں سے پوچھتا ہوں، دوستوں! ترکِ دنیا اور "نفس کشی" کے ذریعے، جنگلوں، صحراؤں اور گپھاؤں میں عمریں گذار کے کیا تم نے میرے مالک کا پیغام، اس کا بنایا قانونِ حیات بھی حاصل کیا؟ وہ جواب دیتے ہیں، نہیں ہمیں کوئی قانون، کوئی دستور نہیں ملا، البتہ ہم نے "مَن کی شانتی" اور روح کا سکون حاصل کر لیا ہے —— عقل آواز دیتی ہے کہ روح کا سکون اور من کی شانتی مالک کی اطاعت اور اس کے احکام کی پابندی میں ہے، جنگلوں اور پہاڑوں میں

نہیں ـــ خواہشات کا گلا گھونٹ کے انسانیت زندہ نہیں رہ سکتی، ـــ مالک کے حکم کے مطابق خواہشات کو بروئے کار لانا ہی انسان کی کامیابی ہے۔

میں قدیم مذاہب و ادیان کی چوکھٹ پر آواز لگاتا ہوں ـــ اور ان سے مالک کی ہدایت اور قانونِ حیات و دستورِ زندگی کا مطالبہ کرتا ہوں ـــ مگر مجھے جواب ملتا ہے ہمارے پاس فلسفہ ہے "حکم" نہیں۔ ہمارے پاس عقیدہ ہے "قانون" نہیں۔ ہمارے پاس تصوّرات ہیں پابندیاں نہیں[1]۔ ہمارے پاس مابعد الطبیعات کے بارے میں نظریات کا ایک مجموعہ تو ہے مگر زندگی کا کوئی تفصیلی قانون نہیں ـــ میں پوچھتا ہوں یہ نظریات، یہ عقائد، یہ فلسفہ تمھیں کہاں سے ملا ہے؟ اس کے حصول کا ذریعہ کیا تھا؟ مجھے جواب ملتا ہے کہ یہ تو ہمیں نہیں معلوم، مگر ہزاروں سال سے یہ عقائد نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتے چلے آرہے ہیں۔

عقل مجھے آواز دیتی ہے کہ "آگے بڑھ! یہاں تیری منزل نہیں، تجھے ایسا پیغام چاہیئے، جو زندگی کے اٹھائے ہوئے ہر سوال کا جواب دے سکے۔ ایسا پیغام جس کے بارے میں معلوم ہو کہ، یہ سب کہاں؟ اور کیسے! حاصل کیا گیا، اسے مالک نے انسانوں تک کیسے پہونچایا؟ اور اس کی حفاظت کیسے کی گئی؟۔

یہاں رکنے سے فائدہ نہیں، ان سیکڑوں مذاہب کے مطالعے میں وقت برباد کر کے کچھ نہ ملے گا۔ جب دعویٰ ہی نہیں تو دلیل کی تلاش کیوں؟ اساطیری داستانوں سے دل تو بہلایا جا سکتا ہے، میدانِ عمل میں قدم نہیں بڑھایا جا سکتا۔

حاشیہ [1]:۔ ہندوستان کے سابق صدر اور مشہور دانشور ڈاکٹر رادھا کرشنن نے یہی لکھا ہے۔

ہدائیتُ نامہ

میں ان قدیم مذاہب کی پرپیچ وادیوں سے نکل کے آگے بڑھتا ہوں اور ان مذاہب کی محفل میں قدم رکھتا ہوں جو صاحبِ کتاب کہے جاتے ہیں ــــ یہ مذاہب مجھے پکارتے ہیں یہاں آؤ! ہمارے پاس وہ کتابیں ہیں جو آسمان سے اتاری گئی ہیں۔ اپنے اپنے دور کے مقدس ترین اور عظیم کردار کے حامل انسانوں نے ایک روحانی مخلوق کے ذریعے سے انھیں حاصل کیا ہے ــــ آؤ! اور اپنے مالک کا پیغام ہم سے حاصل کرو۔ میں طمانیت اور آسودگی کا احساس کرتا ہوں کہ اپنے مالک کے بھیجے ہوئے دستورِ حیات سے قریب پہونچ چکا ہوں۔

میری زندگی کا بڑا حصہ فطرت کے جابرانہ ہاتھوں کے ذریعہ مالک کے بنائے ہوئے قانون کا پابند ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ زندگی کے جس چھوٹے سے حصے میں مجھے بااختیار اور آزاد بنایا گیا ہے اس میں بھی اپنے پیدا کرنے والے کی حاکمیت کو برقرار رکھوں اور اپنے ارادہ و اختیار سے اس کی پابندی کروں۔

مجھے یقین ہو چکا ہے کہ آسمان کا پیغام زمین کے دامن میں محفوظ ہے۔ میں جہالت کے اندھیروں میں زندگی گزارنے کے لئے نہیں پیدا کیا گیا ہوں

اس حیرت کدۂ عالم میں پھینکا نہیں بھیجا گیا ہوں اس لئے کہیں نہ کہیں علم و ہدایت کی روشنی موجود ہے۔

اب میری فکر آسمانی کتابوں کے چوراہے پر کھڑی ہے، اسے فیصلہ کرنا ہے کہ کدھر جائے۔

اس آسمانی کتب خانے میں تو کتابوں کا اتنا بڑا ذخیرہ ہے کہ ان سب کے تفصیلی مطالعے کے لئے کئی زندگیاں درکار ہیں — ایک کتاب کے نام پر درجنوں کتابیں۔ ایک انجیل کے نام پر کئی اناجیل — یعنی ان کتابوں کی امتوں کے افراد نے اپنے اپنے طور پر الگ الگ کتابیں تحریر کر لی ہیں۔

میری عقل ناقابلِ تردید فیصلہ کرتی ہے کہ ان الہامی کتابوں میں میرے جیسے انسانوں کی کاوشیں بھی شامل ہیں۔ انسانی خیالات کی آمیزش بھی ہے۔ ورنہ ایک کتاب کی کئی شکلیں نہ ہو جائیں؟۔

مجھے اپنے پیدا کرنے والے کے ان فرمودات کی ضرورت ہے جو تمام شکوک و شبہات سے بالاتر ہوں، جو میرے اوپر حجت تمام کریں تاکہ میں اس پر عمل کر کے مالک کی بارگاہ میں بری الذمہ ہونے کا یقین حاصل کر سکوں۔

مجھے ان متعدد کتابوں میں سے کسی کتاب کو جھٹلانے کا حق نہیں مگر ایسی کتاب کو اپنے مالک سے منسوب کر کے صد فی صد صحیح سمجھ لینے کی بھی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ان تمام کتابوں کے مطالعے کا بھی میرے پاس وقت نہیں۔ زندگی کم ہے

اور میدانِ حیات عمل کے لئے آواز دے رہا ہے۔

عقل کہتی ہے، کہ جس طرح کائنات کی عادلانہ قوت کے لئے ضروری ہے کہ تیری ہدایت کرے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اس ہدایت نامے تک پہونچنا ناممکن نہ ہو ـــــ ان کتابوں کے علاوہ کوئی ذریعہ بھی میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے جو ہدایت کی ذمہ داریوں کو پورا کرے ـــــ عقل و شعور اپنی نارسائی کا اعلان کر چکے ہیں ـــــ درخت بولتے نہیں، پہاڑ گفتگو نہیں کرتے، دریا خاموش ہیں، ـــــ اور بالفرض اگر یہ درخت، یہ پہاڑ، یہ دریا بولنے لگیں ایک ایک کو آواز دے کر اس کی مسئولیت و ذمہ داری بتانے لگیں ـــــ تو یہ دنیا بے جان و بے شعور "کٹھ پتلیوں" کی تماشہ گاہ بن جائے ـــــ سوچ سمجھ، غور و فکر اور تلاش و جستجو کی تمام انسانی صلاحیتیں بے مفہوم ہو جائیں ـــــ یوں ہی اگر اپنی مرضی کا پابند بنانا ہوتا تو انسان کو انسان بنانے کی کیا ضرورت تھی؟۔ فطرت کی زنجیروں میں بندھے ہوئے جانور کیا بُرے تھے۔ ڈگڈگی پر حرکت کرنا تو انھیں بھی آتا ہے ـــــ اور اگر وہ ہر انسانی دل اور انسانی دماغ کو الگ الگ اپنی ہدایت کا مرکز بنا دیتا اور ہر وقت انسان کا دل یا دماغ حرکت و عمل کے لئے ٹیپ ریکارڈ کی طرح بولتا رہتا تو انسان، انسان کے بجائے کمپیوٹر کی مشین ہوتا ـــــ عقل و شعور کے ساتھ ارادہ و اختیار کی آزادی کا کوئی مفہوم نہ ہوتا۔

"کتاب، ہی وہ آخری طریقہ ہدایت ہے جو میری سمجھ میں آرہا ہے ـــــ جس کے لئے ضروری ہے کہ کسی ایسے انسان کے ذریعہ جامعہ انسانی کے حوالے کی جائے

جو اپنے مالک کی اطاعت، اس کی محبّت، اس کی ناراضگی کے خوف کا جذبہ سب سے زیادہ رکھتا ہو۔ جو کردار و سیرت، سچّائی اور امانت داری کی اس بلند ترین سطح پر کھڑا ہو جہاں، جھوٹ، افترا، حرص و ہوس اور خطا و نسیان کا گذر نہ ہو سکے، ورنہ معمولی اور کمزور کردار کے انسان سے کمی زیادتی اور انسانی خیالات کی آمیزش کا خطرہ باقی نہ رہے گا اور کتاب پر مکمل اعتماد نہ پیدا ہو سکے گا۔

اب مجھے اس کتاب کی تلاش ہے، جس کی الگ الگ شکلیں نہ ہوں جو اپنے نزول کے وقت سے لے کر آج تک ایک ہی شکل و صورت میں محفوظ ہو۔ اس لئے کہ جس "عدل" کا تقاضا ہے کہ ہدایت نامہ جاری کرے اسی عدل کا تقاضا ہے کہ اس کی حفاظت بھی کرے۔ یا پھر پیغام رسانی کے سلسلے کو منقطع نہ ہونے دے ــــ ورنہ انسانوں پر حجّت نہ قائم ہو گی اور وہ اپنی بے راہ روی میں معذور ہوں گے۔

• میں سب سے پہلے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں جو سب کے آخر میں نازل ہوئی ہو ــــ اس لئے کہ بعد کا پیغام اپنے پہلے پیغام کا یا ناسخ ہو گا یا مصدّق، یا تکرار ہو گا یا تردید، یا اضافہ ہو گا یا تخفیف کیونکہ درمیانی وقت کا فاصلہ اس بات کا متقاضی ہے کہ بعد والے پیغام میں ان مسائل و معاملات کا ذکر بھی ہو جو پہلے نازل ہونے والی کتابوں کے نزول کے وقت پیدا نہیں ہوئے تھے۔ اور ان معاملات و مسائل کا تذکرہ نہ ہو جو صرف پچھلی کتابوں کے نزول کے وقت تھے اور اب نہیں ہیں اور نہ آئندہ پیدا ہونے والے ہیں۔

• اور میری عقل اس کتاب کو تلاش کر رہی ہے، جس کے بارے میں خبروں کی بنیاد عقیدہ نہیں بلکہ تاریخ ہو۔ یعنی اس کتاب کے نزول کا دعویٰ اس وقت نہ کیا گیا ہو جب علم تاریخ نے آنکھیں نہیں کھولی تھیں بلکہ تاریخ کی دور میں نازل ہوئی ہو ___ تاریخ اسے بھی جانتی ہو جس نے اس کتاب کا دعویٰ کیا اور انھیں بھی مع ولدیت کے پہچانتی ہو جن کے سامنے دعوی کیا گیا۔ اور ان دنوں کو بھی قلم بند کر چکی ہو جب دعویٰ کیا گیا۔ میں اس تاریخ کی بات کر رہا ہوں جس کا کوئی مذہب نہیں ہوتا۔ مجھے اس سے بحث نہیں کہ تاریخ لکھنے والے اس دعوے کی صداقت کے قائل ہیں یا نہیں۔ مجھے تو بس اس سے سروکار ہے کہ تاریخ دعوائے نزول کی پوری وضاحت کے ساتھ خبر دے رہی ہو۔

میں جانتا ہوں کہ ہر دعویٰ سچا نہیں ہوتا مگر ہر دعویٰ جھوٹا بھی نہیں ہوتا۔ ہر دعویٰ خود اپنی دلیل ہے جبتک اسے جھوٹ نہ ثابت کر دیا جائے۔ البتہ جہاں دعویٰ ہی نہ ہو وہاں سر کھپانا بے کار ہے۔

یہی نظام فطرت ہے، یہی نظام معاشرت اور یہی عقل عامہ کا فیصلہ۔

میں پتہ لگاتا ہوں ___ کہ ان آسمانی کتابوں میں وہ کون سی کتاب ہے جو سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے؟۔

کیا ایسی بھی کوئی کتاب ہے جو دعوائے نزول کے زمانے سے آج تک ایک ہی شکل میں محفوظ ہو؟ اور ___ وہ کون سی کتاب ہے جو افسانوی دور کے اندھیرے میں نہیں بلکہ عہدِ تاریخ کے اجالے میں انسانوں کے سامنے

آئی ہو۔

مجھے جامعہ انسانی خبر دیتا ہے کہ اس کتاب کا نام "قرآن" ہے۔ جو سب سے آخر میں سامنے آئی ہے ــــ تاریخ کی روشنی میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ اور صرف وہی اکیلی کتاب ہے جس کی کوئی دوسری شکل نہیں۔ اور ٹھیک اسی طرح آج بھی موجود ہے جیسی اپنے ظہور کے پہلے دن تھی ــــ لاکھوں بار، درجنوں مکاتب فکر اور مختلف مسلکوں کے ماننے والوں اور اداروں نے اسے شائع کیا ہے، ملکوں ملکوں میں چھپی ہے مگر کسی دو اشاعتوں میں ایک حرف یا ایک حرکت کا فرق بھی نہ پیدا ہو سکا۔

میری فکر تقریباً ڈیڑھ ہزار مذاہب کی پرپیچ وادیوں سے گذر کے قرآن کے سامنے رُک جاتی ہے۔

عقل کہتی ہے اب آگے کوئی راستہ نہیں، تجھ پر حجت تمام ہو چکی ہے، تجھے دوسری کتابوں کو جھٹلانے کا حق حاصل نہیں مگر اس آخری کتاب کو نظر انداز کر کے اس پر کسی دوسری کتاب کو ترجیح دینے کے لئے کوئی عذر معقول نہیں ایسا کرنا عقل و منطق کی نگاہ میں "جرم" ہے۔

میں غور کرتا ہوں، سوچتا ہوں کہ کہیں اس سفر میں مجھے دھوکا تو نہیں ہوا؟ میری فکر نے غلطی تو نہیں کی؟ کہیں میں اپنی منزل چھوڑ کے آگے تو نہیں بڑھ آیا؟ میں اپنے اس فکری سفر کا جائزہ لیتا ہوں ــــ عقل کہتی ہے تو صحیح اور منطقی راستوں سے گذر کے یہاں تک پہونچا ہے۔ دل مطمئن ہے کہ اس سفر

یں، میں نے کوئی ایسا فیصلہ نہیں کیا ہے جس کے لئے عقل کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے اور مالک کی بارگاہ میں مجرم قرار دیا جاؤں۔

مجھے یقین ہے کہ عقل و شعور سے کام نہ لینا مالک کی نافرمانی اور اس کے اس عطیہ کی توہین ہے اور عقل و شعور کے فیصلوں کے خلاف عمل کرنا اس سے بغاوت ہے۔

میں صرف شک کی بنیاد پر کہ ہو سکتا ہے یہ کتاب بھی مالک کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ نہ ہو، قرآن کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

کیا کوئی پیاسا! یہ کہہ کے جامِ آب لینے سے انکار کر سکتا ہے کہ جو چیز مجھے پیش کی جا رہی ہے ۔۔۔ ہو سکتا ہے پانی کے بجائے کچھ اور ہو؟۔۔۔ نہیں! ایسا نہیں ہو سکتا۔ پیاس اسے مجبور کرتی ہے کہ وہ جامِ آب ہونٹوں سے لگائے ۔۔۔ جامِ آب پیش کرنے والے کا دعویٰ ہی اس کے لئے حجت ہے۔ بلا تاخیر وہ اسے پینے کی کوشش کرے گا۔ اگر پانی ہے تو پی کے سیراب ہو جائے گا ورنہ اگل دے گا۔

میں بھی اپنے مالک کے پیغام کی پیاس لئے ہوئے اس کے احکام کی تشنگی سے بے تاب قرآن کو سینے سے لگا لیتا ہوں۔ ...
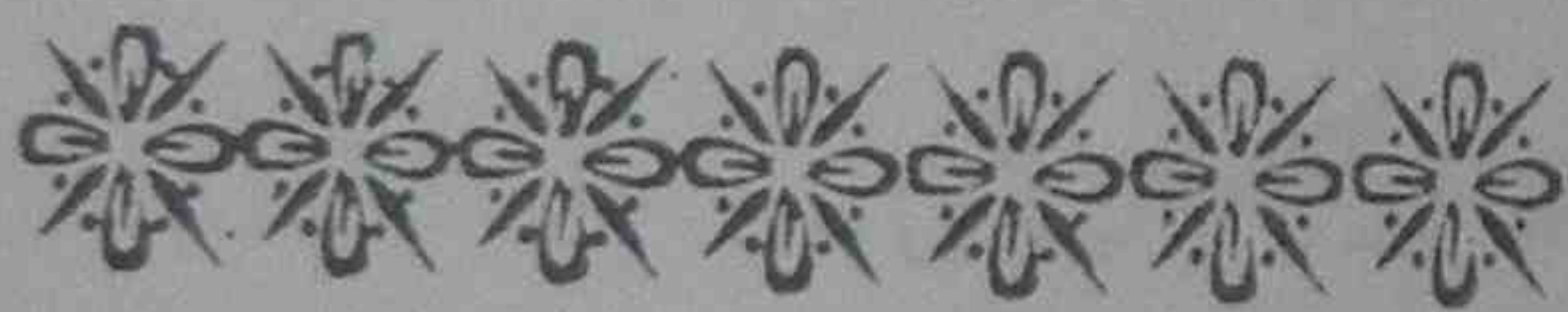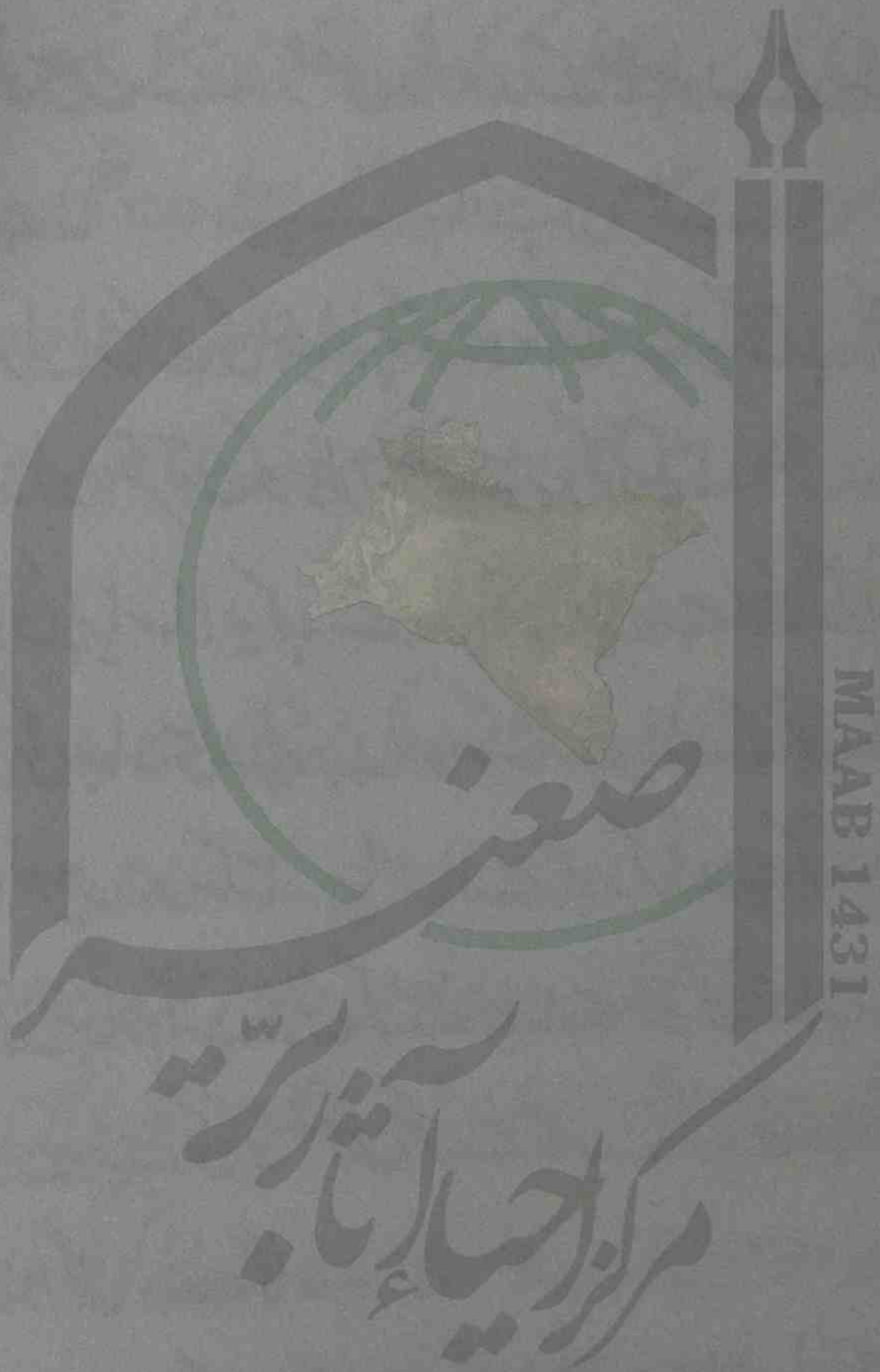
قرآن کی روشنی میں

اب میں قرآن کا ورق الٹتا ہوں ــــــ پہلے فقرے پر نظر پڑتی ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(اللہ کے نام سے جو رحمٰن و رحیم ہے)

یعنی اس قدرتِ کاملہ اور رحمتِ واسعہ نے جو ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے اپنے "نام" کے لئے لفظ "اللہ" کو مخصوص کیا ہے ــــ اب میں اسی نام سے اسے پکاروں گا، اسے آواز دونگا، اس سے گفتگو کروں گا ــــ کیسا مقدّس، پیارا اور دل و دماغ کو مطمئن کر دینے والا نام ہے۔

میں نے جن تاروں کی چھاؤں میں راتیں گذاری ہیں، جن درختوں کے سایہ میں سفر کیا ہے، جن بادلوں کو برستے دیکھا ہے، جن پھلوں سے لذّتِ کام و دہن حاصل کی ہے، جن پھولوں نے دل و دماغ کو معطر کیا ہے، جن دریاؤں کے پانی سے پیاس بجھائی ہے، جس ماںتا کی گود میں پرورش پائی ہے، جس شفقتِ پدری نے پروان چڑھایا ہے۔ سب یک زبان ہو کے آواز دے رہے ہیں کہ بے شک وہ ــــ "رحمٰن بھی ہے اور رحیم بھی" اس کی رحمت عام بھی ہے اور مخصوص بھی۔

پہاڑوں سے گرنے والے آبشار زبانِ حال سے پکار رہے ہیں کہ ــــ

ہمیں تمہارے لئے سقائی کے ساتھ پتھروں کو توڑ توڑ کے "ریت" بنانے کی ذمہ داری بھی سونپی گئی ہے تاکہ تم عمارتیں بنا سکو۔ برستے ہوئے بادل آواز دیتے ہیں کہ ہمیں.... تمہارے جانوروں اور پیڑ پودوں کی پیاس بجھانے کی خدمت پر مامور کر دیا گیا ہے۔

کھلتے ہوئے پھول اور انھیں جھولا جھلانے والی "موجِ ہوا" آواز دیتی ہے کہ ہمیں تمہاری محفلوں کو معطر کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

پختہ ہو جانے کے بعد شاخوں سے ٹوٹ کے زمین پر گر جانیوالے پھل، "زبانِ حال" سے کہتے ہیں کہ جب تک ہم تمہارے استعمال کے قابل نہ تھے، شاخوں سے چپکے رہنے کا حکم تھا، پک جانے کے بعد ہمیں مجبور کر دیا گیا ہے کہ خود کو تمہارے قدموں میں گرا دیں اور ان پھلوں کی گٹھلیاں آواز دیتی ہیں ہمیں بیکار نہ سمجھنا ہم تمہاری آنیوالی نسلوں کے خدمت گذار ہیں۔

امنڈتے ہوئے سیلاب صدا دیتے ہیں کہ ہم تمہارے گھروں کو گرانے کے لئے نہیں بھیجے گئے ہیں ہمارا کام تمہارے کھیتوں کو زیادہ سے زیادہ زرخیز بنانا اور تمہارے تالابوں اور دریاؤں میں مچھلیوں کا ذخیرہ پہونچانا ہے تاکہ تمہاری غذائی ضرورت پوری ہو۔ گھر ہم نہیں تم گراتے ہو اپنی ناقص تعمیر اور ہمارے راستے میں رکاوٹوں کے ذریعے۔

آتش فشاں اپنے دھماکوں کی زبان میں آواز دے رہے ہیں کہ، ہمارا کام تمہارے لئے زمین کے سینے میں چھپے ہوئے خزانوں کو باہر نکالنا ہے۔

ہماری شعلہ سامانیوں سے بچنا تمہاری اپنی ذمہ داری ہے۔

قبرستان کی طرف جاتے ہوئے جنازے زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں ہم تمہارے "تازہ واردانِ بساطِ حیات" کے لئے جگہ خالی کر کے جارہے ہیں تاکہ نئے مہمانوں کو تکلیف نہ ہو۔

اور "موت" کہتی ہے ہمیں حکم ملا ہے کہ جادۂ حیات میں تھکے ہارے مسافروں کا بوجھ اتار کے انھیں اپنی آغوش میں سکون کی نیند سلالیں۔

الغرض میں اس کی رحمت کے گواہوں کے نرغے میں گھرا ہوا ہوں جس سے انکار ممکن نہیں۔ میرے مالک نے سب سے پہلے اپنی اسی صفت کا ذکر کیا ہے یہ بھی اس کی رحمت کی دلیل ہے۔

قرآن کے دوسرے فقرے پر نظر پڑتی ہے۔

ساری تعریفیں اللہ کے لئے جو تمام عالمین کا پالنے والا ہے، اور — سر پر چمکتا ہوا سورج آواز دیتا ہے کہ میری روشنی اسی مالک کا عطیہ ہے۔ چاند زبانِ حال سے پکار رہا ہے میری پُرسکون چاندنی اسی کا فیض ہے۔ ستارے بتا رہے ہیں کہ قمقموں کی جھلملاہٹ اسی کے کرم کا پرتو ہے۔ کھلتی ہوئی کلیاں، مہکتے ہوئے پھول شہادت دیتے ہیں کہ یہ اسی کی صنعت گری ہے کہ ہمیں رنگ و نکہت اور ہمارے ہی ماں جائے کانٹوں کو نشتر زنی کی صلاحیت بخش دی — قابلِ تعریف وہ ہے ہم نہیں، اسے بھلا کے ہماری تعریف دیانتِ نظر نہیں، نظامِ کائنات سے بغاوت ہے۔

گہوارے میں ہمکتا ہوا شیر خوار، مامتا کے سینے میں جوش کھاتا ہوا شیرِ مادر، دھڑکتے ہوئے دلوں میں مجبوروں کے لیے جذبۂ ہمدردی، ہواؤں میں غذا تلاش کرنیوالے پرندے، سمندروں کی تہہ میں اگنے والے نباتات زمین کے سینے میں چھپے ہوئے کیڑے، پتھروں میں دبے ہوئے جاندار لاتعداد معذور انسانوں کی کامیاب زندگیاں، کئی من غذا کھا جانیوالا ہاتھی اور ایک چھوٹے سے ذرّے سے پیٹ بھر لینے والی چیونٹیاں، ہم زبان ہو کے گواہی دے رہی ہیں: "ہر حال میں وہی پالنے والا ہے"۔

میں قرآن میں مرقوم آیات کو کائنات میں پھیلی ہوئی زندہ آیات سے ملاتا ہوں تو مجھے نظر آتا ہے کہ دونوں میں "سرمو" فرق نہیں۔ ایسی حسین اور مضبوط مطابقت کو دیکھ کے کہنا پڑتا ہے کہ قرآن کائنات کی تصویر اور کائنات قرآن کی تفسیر ہے۔

قول و عمل کی یہ ہم آہنگی مجھے یقین دلا رہی ہے کہ بلاشبہ "قرآن" تیرے نام تیرے مالک کا پیغام ہے۔

اب مجھے الٰہیات کے کسی فلسفے کا دروازہ کھٹکھٹانے کی ضرورت نہیں کسی افلاطون و ارسطو سے علم کی بھیک مانگنے کی حاجت نہیں، اب میں قرآن کے آئینے میں ہر شے کا اصلی چہرہ دیکھ رہا ہوں میرے گردوپیش

قرآن کی روشنی پھیلی ہوئی ہے، میری نگاہوں میں ہر شکل واضح اور بے نقاب ہے ۔ اب نہ مجھے "جامِ جم" چاہیئے نہ قسمت حال بتانے والے "زائچے" قرآن مجھے سب کچھ بتا رہا ہے ماضی، حال، مستقبل سب کی تفصیلات بتا رہا ہے ۔ اندرون جسم کی تصویر کشی کرنے والی "اکسریز" صرف جسم کے مادّی حصّوں تک محدود رہتی ہیں مگر آیاتِ قرآنی کی شعاعیں تو روح کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔

مجھے کیا ضرورت ہے کہ دنیا کے مکتبہ ہائے فکر سے علم کی بھیک مانگوں؟ بند کمروں میں بیٹھ کے علم کی "پیاز" کے چھلکے اتارنے والے فلسفی مجھے کیا بتائیں گے؟ ابن سینا ہوں یا فارابی، رازی ہوں یا ابنِ رشد ۔ مجھے کسی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں ۔ مراقبے کے ذریعے حقائق کا پتہ لگانیوالے قطب و ابدال ہوں یا دھیان سے گیان حاصل کرنیوالے "رِشی مُنی" اب مجھے کسی سے کچھ پوچھنا نہیں ہے ۔ قرآن مجھے ایک ایک ذرّے کی معنویت، مفہوم اور مقصد واضح لفظوں میں بتا رہا ہے ۔

اب مجھے "وحدت الوجود، وحدت الشہود، محرّک اوّل، مبداء، مجاز و حقیقت جیسی فلسفیانہ اصطلاحیں بے مصرف نظر آ رہی ہیں اور متکلمین کی بحثیں دیکھ کے "اندھوں کا ہاتھی یاد آتا ہے"۔

اور کشف و شہود، شاہد و مشہود، اور ہمہ اوست جیسے نعرے سُن کے ہنسی آتی ہے ۔ اب تک صرف میری عقل اور میرا شعور میری رہنمائی کر رہا تھا

اور اب تو قرآن کی روشنی بھی میرے ساتھ ہے۔ اب مجھے جذب و سلوک اور "ترک و ترکِ ترک" جیسے چیستانی راستوں سے گذرنے کی ضرورت نہیں قرآن پوری وضاحت کے ساتھ سیدھے راستے کے تفصیلات بتا رہا ہے۔

مجھے ایران و ہندوستان کے صوفی شعراء کے وہ اشعار پڑھ کے حیرت ہوتی ہے جس میں ہجر و فراق کے راگ الاپے گئے ہیں، جدائی کے نوحے پڑھے گئے ہیں، اور وصل کی تمنّا کی گئی ہے۔

غلام اور آقا میں جدائی کیسی؟ قرآن آواز دیتا ہے ــ وہ تیری رگِ حیات سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اس سے زیادہ قریب کوئی نہیں، خود میں بھی اپنے وجود سے اتنا قریب نہیں جتنا میرا مالک مجھ سے قریب ہے۔ البتّہ معنوی اور رضامندی و خوشنودی کے اعتبار سے اچھے اعمال اس سے قربت اور بُرے اعمال دوری پیدا کر دیتے ہیں ورنہ ہم سب اس کی آغوشِ رحمت میں پل رہے ہیں ـــــ قرآن کی روشنی میں یہ دنیا مجھے بازیچۂ اطفال نہیں درسگاہِ معرفت نظر آرہی ہے اب یہ "حیرت کدہ" نہیں میرے لئے کارگاہِ علم و صداقت ہے میرے سامنے "سراب" نہیں علم و آگہی کے سرچشمے ہیں۔

اب مجھے ہر نقش "نقشِ فریادی" نہیں نقشِ شکر گذار نظر آرہا ہے۔ کوئی شے کاغذی پیراہن" میں نہیں بلکہ ہر شے بہترین و مناسب ترین لباسِ وجود میں دکھائی دیتی ہے۔ ★★★

قرآن کی بارگاہ میں

اب میں قرآن سے اپنے مالک کی ذات وصفات کے بارے میں سوال کرتا ہوں، کہ میں جس ربوبیت کا مشاہدہ کر رہا ہوں، جس کا کرم مجھے ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہے، جس کے جلال و جبروت کا سمندر میرے چاروں طرف ٹھاٹھیں مار رہا ہے ــــ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کیسا ہے؟ قرآن پوری وضاحت سے جواب دیتا ہے۔

- وہ ایک ہے بے نیاز ہے نہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا نہ کوئی اس کا ساتھی ہے نہ ہمسر ــــــــــــ (اخلاص)
- ہمیشہ سے موجود اپنی ذات سے قائم، نہ اسے اونگھ آتی ہے نہ نیند۔ آسمان وزمین میں سب کچھ اُسی کا ہے، کسی کو اس کی بارگاہ میں مجالِ شفاعت نہیں۔ (البقرہ ۲۵۵)
- وہی ہر شے کا خالق اور سب پر غلبہ رکھنے والا ہے۔ (الرعد ۱۶)
- وہ رحمٰن ورحیم اور انجام کار کا مالک ہے۔ (الفاتحہ)
- وہ ہر شے پر قدرت رکھنے والا ہے۔ (آل عمران ۲۹)
- جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور اُن کے درمیان میں ہے اور جو کچھ زمین کی تہہ میں ہے اُسی کا ہے۔ (طٰہٰ ۶)
- وہی آسمان سے لے کر زمین تک کے امور کا انتظام کرتا ہے۔ (السجدہ ۵)

- وہی زمین و آسمان کی سلطنت کا مالک ہے۔ (البقرہ ۱۰
- اُسی نے نیکی اور بدی کی سمجھ عطا کی (الشمس ۸
- وہی زمین و آسمان سے رزق دیتا ہے۔ (فاطر ۳
- وہی سب سے بہتر رزق دینے والا ہے۔ (جمعہ ۱۱
- سورج چاند ستارے اسی کے حکم کے پابند ہیں۔ اسی نے پیدا کیا اور اسی کی حکمرانی ہے۔ وہی خلق و امر کا مالک ہے۔ (الاعراف ۵۴
- اس کے اقتدار میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ (الفرقان ۲
- سب اسی کے اطاعت گذار ہیں۔ (الروم ۲۶
- زمین و آسمان کا ہر ذرّہ اُس کی تسبیح میں مشغول ہے۔ (جمعہ ۱
- ہر طرح کا اختیار صرف اُسے حاصل ہے (آل عمران ۱۵۴
- تمام امور کا مرجع وہی ہے۔ (الحدید ۵
- وہی غالب و دانا و باخبر ہے۔ (الانعام ۱۸
- پوشیدہ اور ظاہر تمام چیزوں کا جاننے والا ہے۔ (الرعد ۹
- کائنات میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے۔ (یونس ۶۵
- اگر وہ نقصان پہونچانا چاہے تو اس سے کوئی بچا نہیں سکتا۔ اگر فائدہ پہونچانا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا۔ (الفتح ۱۱
- وہ جسے چاہے معاف کر دے اور جسے چاہے سزا دے، اُس کی قدرت ہر شے پر حاوی ہے۔

- وہ غالب و دانا، گناہوں کا بخشنے والا توبہ قبول کرنے والا سخت عذاب دینے والا اور صاحبِ فضل و کرم ہے۔ (مومن ۳۔۲)
- اُس کے علاوہ نہ کوئی ولی ہے نہ سرپرست کوئی اُس کے حکم میں شریک نہیں۔ (الکہف ۲۶)
- اُس کے علاوہ کوئی پناہ گاہ نہیں۔ (الجن ۲۲)
- صرف اُسی سے مدد مانگنا چاہیئے، اور اُسی کی عبادت کرنا چاہیئے۔ (الفاتحہ)
- وہ غالب بھی ہے رحیم بھی۔ (الشعراء ۹)
- بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔ (الفرقان ۶)
- وہ جو حکم چاہتا ہے دیتا ہے۔ (المائدہ ۱)
- اُس کے حکم پر کوئی نظرثانی کرنے والا نہیں۔ (الانبیاء ۲۳)
- وہ ہرگز کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ (الشعراء ۲۰۹)
- وہ سب سے بڑا حاکم اور فیصلہ کرنے والا ہے۔ (التین ۸)
- وہی مالک ہے پاک و پاکیزہ ہے، سلامتی ہے۔ امان دینے والا ہے، نگرانی کرنے والا ہے، صاحبِ عزّت و جبروت و کبریائی ہے۔ (حشر ۲۳)
- اُس کی بندگی ہی سیدھا راستہ ہے۔ (یٰس ۶۰)
- وہ شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ (ق ۱۶)
- اپنے بندوں کے لئے کافی ہے۔ (زمر ۳۶)
- پکارنے والوں کی فریاد سنتا ہے۔ (مومن ۶۰)

- دُعا کرنے والوں کی فریاد سُنتا ہے۔ (البقرہ ۱۸۶)
- آواز دینے والوں کی مصیبت کو دور کرتا ہے۔ (نمل ٦۲)

میں قرآن سے پوچھتا ہوں اس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟

مجھے قرآن کے ذریعہ مالک کا جواب سُنائی دیتا ہے۔

- ہم نے زمین و آسمان کو اور جو کچھ اُس میں ہے تفریحاً نہیں پیدا کیا۔ (الانبیاء ١٦)
- بلکہ ہر شے کو ایک منصوبے اور حساب کے تحت پیدا کیا ہے۔ (فرقان ۲)
- اور پوری کائنات کو حق اور توازن پر قائم کیا۔ (احقاف ۳)
- ہر چیز کو اس کے لائق خلقت عطا کی پھر ہدایت دی۔ (طٰہٰ ۵۰)
- ہر شے کو محکم بنایا۔ (نمل ۸۸)
- سورج اور چاند کا حساب معین کیا۔ (رحمٰن ۵)
- آسمان کو متوازن اور بلند کیا۔ (رحمٰن ۷)
- زمین و آسمان کو حق کے ساتھ پیدا کیا۔ (الانعام ۷۳)
- آسمان کو سورج اور چاند سے روشن کیا۔ (فرقان ٦١)
- زمین میں کثرت سے عمدہ چیزیں پیدا کیں۔ (شعراء ۷)
- پانی برسایا، زمین کو پھاڑا، اناج اگائے، انگور، ترکاریاں، زیتون، کھجوریں گھنے باغ، میوے تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لئے پیدا کئے۔ (عبس ۲۴-۳۲)
- آسمان کو بلند کیا اور درست کیا رات کو تاریک اور دن کو روشن کیا، زمین کو پھیلایا پانی نکالا، پہاڑوں کو نصب کیا۔ (النازعات ۲۸-۳۲)

- انسانوں کے لئے رات کو لباس، نیند کو سکون، دن کو کام کا وقت بنایا (فرقان ۴۷)
- لوگوں کے لئے زمین سے میوؤں کے خوشے، اناج، خوشبو دار پھلوں کی نعمتیں عطا کیں۔ (الرحمٰن ۱۲)
- زمین کو پانی سے زندہ کیا، اس سے دانہ نکالا، باغ اگائے، چشمے جاری کئے، زمین سے اگنے والی چیزوں اور انسانوں اور تمام چیزیں جن کی انہیں خبر نہیں سب کے جوڑے پیدا کئے۔ وہ رات سے دن کو نکالتا ہے۔ سورج اس کے معین کئے ہوئے حساب سے چل رہا ہے چاند اس کے مقرّر کئے ہوئے منزلوں پر محوِ سفر ہے۔ نہ سورج کے بس میں ہے کہ چاند تک پہونچ جائے نہ رات دن سے آگے بڑھ سکتی ہے۔ سب اپنے اپنے راستوں پر چکّر لگا رہے ہیں۔ (یٰس ۳۳ تا ۴۱)

میں قرآن سے پوچھتا ہوں کہ اس کائنات میں انسان کی حیثیّت کیا ہے؟

قرآن خالقِ کائنات کا پیغام سناتا ہے۔

- ہم نے اسے زمین پر اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ (البقرہ ۳۰)
- زمین پر سب کچھ انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ (البقرہ ۲۹)
- اسے زمین پر اختیار دے دیا۔ (الاعراف ۱۰)
- اسے بہترین خِلقت پر پیدا کیا۔ (والتین ۴)
- رات اور دن کو اس کے اختیار میں دے دیا۔ (ابراھیم ۳۳)
- جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمان میں ہے ان سب کو انسان کا تابعدار

بنا دیا۔ (لقمٰن ۳۱)

* چاند سورج اور ستاروں کو اس کا تابع کر دیا۔ (النحل ۱۲)
* سمندروں کو اس کے قبضے میں دے دیا۔ (النحل ۱۴)
* زمین کو اس کے لئے مسخر کر دیا۔ (الملک ۱۵)

میں قرآن سے پوچھتا ہوں کہ انسان کو تمام مخلوقات پر یہ فضیلت کیوں دی گئی، اس کے سر پر خلافت الٰہیہ کا تاج کیوں رکھا گیا، اسے بزم حیات کی صدارت کیوں سونپی گئی؟

قرآن جواب دیتا ہے۔

- تاکہ وہ شکر گذار بن جائے (الاعراف ۱۰)
- تاکہ وہ اپنے اللہ کی عبادت کرے۔ (الذاریات ۵۶)
- تاکہ وہ اپنے رب کی دی ہوئی نعمتوں کا ذکر کرے (والضحیٰ ۱۱)
- تاکہ اس کے حسن عمل کا امتحان لیا جائے۔ (الملک ۲)

میں قرآن سے سوال کرتا ہوں کہ انسان کا آخری انجام کیا ہوگا؟ تو مجھے جواب ملتا ہے۔

- وہ اللہ کے لئے ہے اور اسے اللہ ہی کی طرف پلٹنا ہے۔ (البقرۃ ۱۵۶)
- وہ اسی زمین سے پیدا کیا گیا ہے اسی میں جائے گا اور اسی سے پھر نکالا جائے گا۔ (طٰہٰ ۵۵)
- اسے لازماً مرنا ہے پھر وہ قیامت میں اٹھایا جائے گا۔ (المومنون ۱۶)

- جس طرح ہم نے پہلی پیدائش کا آغاز کیا تھا اسی طرح اسے دہرائیں گے۔ یہ وعدہ ہے جسے ہم پورا کریں گے۔ (الانبیاء ۱۰۴)
- اچھے برے ہر عمل کے ایک ایک ذرّے کا حساب لیا جائے گا۔ (الزلزال ۸)
- اللہ قیامت کے دن ان کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے گا (البقرہ ۱۱۳)
- اس دن نہ کوئی کسی کا فدیہ بن سکے گا نہ معاوضہ کام آئے گا نہ کوئی سفارش فائدہ پہونچائے گی۔ (البقرہ ۱۲۳)

میں قرآن سے پوچھتا ہوں، قیامت کسے کہتے ہیں؛ مجھے جواب ملتا ہے۔

* وہ دوبارہ زندہ ہونے کا دن ہے۔ (النمل ۶۴)
* جزا وسزا کا دن ہے۔ (صافات ۲۰)
* دادرسی کا دن ہے۔ (الحاقہ ۲۰۱)
* جی اٹھنے کا دن ہے۔ (فاطر ۹)
* مُردوں کو قبروں سے نکالا جانے والا دن، حساب کتاب کا دن ہے۔ (ص ۲۶)
* فیصلوں کا دن ہے۔ (مرسلات ۳۸)
* وعدوں کے پورا ہونے کا دن ہے۔ (النور ۳۷)
* اس دن آسمان کو لپیٹ دیا جائے گا۔ سورج کو گھما دیا جائے گا۔ (الانبیاء ۱۰۴)
* پہاڑ دھنکی ہوئی روئی کی طرح اڑ جائیں گے۔ (القارعۃ ۵)

میں قرآن سے سوال کرتا ہوں کہ مالک کے پسندیدہ بندے کیسے ہوتے ہیں؟ قرآن آواز دیتا ہے

- وہ زمین پر فروتنی کے ساتھ چلتے ہیں اور لوگوں کی سلامتی چاہتے ہیں (فرقان ۶۴)
- وہ اپنے رب کے سامنے قیام و سجدہ کرتے ہیں اور اس کے عذاب سے پناہ مانگتے ہیں۔ (فرقان ۶۵)
- وہ نہ اِسراف کرتے ہیں نہ کنجوسی بلکہ اعتدال کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں (فرقان ۶۷)
- وہ اللہ کے علاوہ کسی کو نہیں پکارتے، کسی بے گناہ کا خون نہیں بہاتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں (فرقان ۶۸)
- وہ برائیوں سے سنجیدگی اور وقار کے ساتھ دامن بچا کے گذر جاتے ہیں (فرقان ۷۲)
- وہ ایک دوسرے کو حق اور صبر کی وصیّت کرتے ہیں۔ (عصر ۳)
- وہ نماز قائم کرتے ہیں اور اللہ سے ملے ہوئے رزق سے انفاق کرتے ہیں۔ (بقرہ ۲)
- وہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسولوں اور ان کی نازل کی ہوئی کتابوں پر ایمان اور آخرت کا یقین رکھتے ہیں (بقرہ ۳۔۴)
- وہ ایمان کے ساتھ نیک اعمال انجام دیتے ہیں۔ (بقرہ ۸۲)
- وہ اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں اور کہتے ہیں ہم رسولوں میں تفریق نہیں کرتے ہیں ہم نے پیغام الٰہی کو سنا اور اس کی اطاعت کی پروردگار اب تیری ہی مغفرت درکار ہے اور تیری ہی طرف پلٹ کے آنا ہے (بقرہ ۲۸۵)
- خدا کی بارگاہ میں عظمت و بزرگی کی بنیاد تقویٰ ہے۔ (حجرات ۱۳)
- اور وہ انصاف کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ (حجرات ۹)
- ان کے لئے نہ ختم ہونے والا اجر و ثواب ہے۔ (انشقاق ۲۵)

میں قرآن سے پوچھتا ہوں کہ ان لوگوں کی پہچان کیا ہے جن سے پروردگار ناراض ہے اور وہ اعمال کیا ہیں جو مالک کی ناخوشی کا سبب بنتے ہیں؟ تو قرآن بتاتا ہے کہ

* وہ آیات الٰہی کا انکار کرتے ہیں۔ (آل عمران ۴)
* وہ شیطان کی پیروی میں برائی اور بدکاری کا حکم دیتے ہیں۔ (بقرہ ۱۶۹)
* وہ مالک کی طرف سے منہ موڑ لیتے ہیں (غاشیہ ۲۳)
* وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کی طرف پلٹ کے نہیں جانا ہے۔ (انشقاق ۱۴)
* وہ ناپ تول میں کمی کرتے ہیں (المطففین ۱)
* وہ روز جزا کا انکار کرتے ہیں (المطففین ۱۱)
* وہ، آیات الٰہی سن کے کہتے ہیں یہ تو پرانے قصے کہانیاں ہیں۔ (المطففین ۱۳)
* وہ حساب کتاب کی امید نہیں رکھتے۔ (النباء ۲۷)
* وہ نماز نہیں پڑھتے، مسکین کو کھانا نہیں دیتے، برے کاموں میں شرکت کرتے ہیں (والمدثر ۴۳-۴۴-۴۵)
* وہ اللہ سے کیا ہوا عہد توڑ دیتے ہیں جسے خدانے جوڑنے کا حکم دیا تھا اسے کاٹ دیتے ہیں اور زمین پر فساد برپا کرتے ہیں (البقرہ ۲۷)
* وہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ (البقرہ ۲۱۲)
* وہ، اللہ کی نعمتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے رسولوں کو جھٹلاتے ہیں۔ (النحل ۱۱۲-۱۱۳)
* ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ (انشقاق ۲۴)

— اب میں قرآن سے خود اس کے بارے میں سوال کرتا ہوں کہ اس کی حیثیت کیا ہے اور وہ کیسے عالم وجود میں آیا؟ تو قرآن سے جواب ملتا ہے۔

- اللہ کی طرف سے نازل ہوا۔ (الشعراء ۱۹۲)
- اور۔ روح الامین کے ذریعہ قلب پیغمبر پر اتارا گیا ہے (الشعراء ۱۹۳)
- جھوٹ نہ اس کے آگے پھٹک سکتا ہے نہ پیچھے سے۔ (فصلت ۴۲)
- تمام انسانوں کے لئے حقائق کا اظہار اور اللہ کے اطاعت گذار بندوں کے لئے نصیحت اور ہدایت ہے۔ (آل عمران ۱۳۸)
- اہل ایمان کے لئے شفا اور ہدایت ہے۔ (فصلت ۴۴)
- کوئی خشک و تر ایسا نہیں جو کتاب مبین میں نہ ہو (الانعام ۵۹)
- خدا ہی نے اسے نازل کیا ہے اور وہی اس کی حفاظت کرنے والا ہے (حجر ۹)
- اس کا جمع کرنا اور پڑھوانا بھی اسی کی ذمہ داری ہے۔ (قیامہ ۱۷)

میرے پاس کوئی ایسی دلیل نہیں جس کی بنیاد پر قرآن کے ان دعوؤں کا انکار کرسکوں اور کوئی ایسا عذر نہیں کہ اس کی دی ہوئی خبروں کو جھٹلا سکوں۔

قرآن کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اس کے علاوہ دنیا میں کوئی ایسا ہدایت نامہ موجود نہیں جس کی اطاعت کرکے مالک کی بارگاہ میں بَرِیُّ الذِّمَّہ ہونے کا یقین حاصل کرلوں۔ اور قرآن پر عمل کرکے بلا خوف تردید اپنے مالک کی بارگاہ میں

اپنے ضمیر کی عدالت میں اور اپنی عقل و شعور کے سامنے کہہ سکتا ہوں کہ ـــــ میرے پالنے اور پیدا کرنے والے کے فرمودات حاصل کرنے کے لئے، اس کے احکام معلوم کرنے کے لئے اس کے بنائے ہوئے ضابطہ حیات تک پہونچنے کے لئے پورے کرۂ ارض پر قرآن کے علاوہ مستند، معتبر اور حجّت تمام کرنے والا کوئی دوسرا ذریعۂ ہدایت موجود نہ تھا اس لئے مجھ پر واجب تھا کہ میں اس کی اطاعت کروں۔

پھر آخر میں کیوں کہوں کہ قرآن میرے مالک کا کلام نہیں ہے ـــــ اس "کیوں" کا میرے پاس کیا جواب ہے؟ ـــــــــــــــ

کیا میں کہوں کہ میرے مالک نے مجھے اپنی ہدایت کا محتاج تو بنایا ہے، مگر ہدایت نامہ نہیں مرحمت فرمایا؟ ـــــ ایسی مہمل گفتگو کے لئے میرا وجدان راضی نہیں۔

لیکن ـــــ اس کے علاوہ بھی قرآن کا لفظ لفظ گواہی دے رہا ہے کہ یہ کسی انسانی کاوش کا نتیجہ نہیں۔ اور اس کے بے شمار خصوصیات یہ دلیل قائم کرتے ہیں کہ یہ اسی خالق و مالک کا کلام ہے جس نے انسان و کائنات کو پیدا کیا ہے۔

ـــــ اس کی فصاحت و بلاغت کا حیرت انگیز معیار جس کی کوئی مثال نہ قرآن سے پہلے کہیں تھی نہ قرآن کے وجود میں آنے کے بعد کہیں نظر آئی۔

ـــــ اس مختصر سی کتاب میں زندگی کے اٹھائے ہوئے ہر سوال کا جواب موجود ہے۔

ـــــ طبعیات، معنویات اور غیبیات کے تمام موضوعات کو اس طرح سمیٹ لینا انسانی طاقت سے باہر ہے۔

— ایک ایسا انسان جس نے کسی سے پڑھنا لکھنا بھی نہ سیکھا ہو ایک ایسی کتاب کیسے ترتیب دے سکتا ہے جو تمام علمی موضوعات کا احاطہ کئے ہوئے ہو۔

— ایک ایسا نصاب تعلیم ترتیب دینا انسانی قوت کا کارنامہ نہیں ہو سکتا جو صرف ۲۳ سال میں، بدترین عادات کی خوگر، سرکش، بت پرست اور اوہام پرست قوم کو "علم و کردار" کی بلندی پر پہونچا دے۔

— انسانی نظریات میں تبدیلی آتی رہتی ہے اور حالات و زمانہ کے ساتھ خیالات بدلتے رہتے ہیں۔ دنیا کا کوئی مفکر یا دانشور، ایسا نہیں جس نے کبھی نہ کبھی خود اپنے ہی نظریات کی تردید نہ کی ہو، یا دوسروں نے اس کے کسی نہ کسی فیصلے کو غلط نہ ثابت کر دیا ہو۔

— مگر قرآن اپنی پہلی آیت سے لیکر آخری آیت تک معجزانہ ہم آہنگی کا شاہکار ہے۔ نہ اس کے مفہوم میں کہیں تضاد ہے نہ اسلوب میں۔

● — یہ ایک ایسا ہمہ گیر ضابطہ اخلاق اور دستور حیات ہے جسے وضع کرنا انسان کے بس میں نہیں۔

● — قرآن نے طبعیات اور نظام کائنات کے بارے میں جتنی خبریں دی ہیں "وقت" تردید کے بجائے تائید کرتا آ رہا ہے۔

● — قرآن نے ان کائناتی حقیقتوں کو بیان کیا جن کا تصور بھی آج سے چودہ سو سال قبل محال تھا۔

- یہ ایک ایسا کلام ہے جو نہ نظم ہے نہ نثر مگر نظم کی تاثیر اور نثر کی تبیین کا شاہکار ہے۔
- ہر عہد کا معیار علم و تحقیق مختلف ہوتا ہے۔ ایک زمانے میں کوئی "نظریہ" مقبول ہوتا ہے تو دوسرے زمانے میں وہی نظریہ مردود ہو جاتا ہے۔ مثلاً گذشتہ دور میں زمین کا ساکت ہونا طے شدہ تھا اور عہد حاضر میں اس کا متحرک ہونا ابدی حقیقت سمجھا جاتا ہے اس لئے کسی انسان کے قبضۂ قدرت میں نہیں کہ وہ کوئی ایسی کتاب لکھ دے جو ہر زمانے کے دستِ تنقید و اعتراض سے بالاتر رہے۔
- اور اگر قرآن انسانی کلام ہے تو کوئی آج تک قرآن کے اُس چیلنج کا جواب کیوں نہیں دے سکا کہ تمام جن و انس مل کے بھی اس کا بلکہ اس کے ایک سورہ کا بھی جواب نہیں لا سکتے۔

الغرض قرآن نے "لا ادریت" کی ساری دیواریں گرا کے مجھے "بَیِّنَۃٍ مِّن رَّبِّی" کی روشنی میں کھڑا کر دیا ہے۔ اور مجھے مجبور کر دیا ہے کہ میں اپنا سرِ اطاعت اس کی بارگاہ میں خم کر دوں ـــــــــ

اب میں قرآن سے اُس عظیم انسان کی ذات و منصب کے بارے سوال کرتا ہوں جس کے ذریعے سے مجھے اللہ کا بھیجا ہوا ہدایت نامہ حاصل ہوا ہے۔ میں قرآن سے پوچھتا ہوں کہ اس جامعہ انسانی میں اس کی حیثیت کیا ہے جس کا پاک و پاکیزہ دل وحی الٰہی کی منزل بنا ـــــــــ قرآن کہتا ہے:

- وہ اپنی خواہش سے کوئی گفتگو نہیں کرتا، وہی کہتا ہے جو وحی ہوتی ہے (نجم ۴)

- اُس کو زبردست قوّت والے نے تعلیم دی ہے۔ (نجم ۵)
- اللہ کے ساتھ اُس کی اطاعت بھی ضروری ہے۔ (انفال ۲)
- کسی کو حق نہیں کہ اللہ اور اُس کے فیصلے کے مقابلے میں کوئی فیصلہ کرے۔ (احزاب ۵)
- جس نے اُس کی اطاعت کی اس نے خدا کی اطاعت کی۔ (النساء ۱۱)
- اُس کی سیرت بہترین نمونہ عمل ہے (احزاب ۳)
- اگر اُس کی اطاعت کروگے تو ہدایت پاؤگے۔ (النور ۷)
- اُس کی اطاعت خدا کی محبت کا لازمہ ہے۔ (آل عمران ۴)
- وہ تمام عالم کے لئے رحمت ہے۔ (سورہ انبیاء ۱۰۷)
- اللہ و ملائکہ اُس پر صلوٰۃ کرتے ہیں اے ایمان والو تم بھی اُس پر صلواۃ بھیجو۔ (احزاب ۵۷)

قرآن کی ان آیتوں کی روشنی میں مجھے ماننا پڑتا ہے کہ وہ عام انسانوں جیسا نہیں بلکہ اُس کا وجود انسانیت کی رُوح اور اس کی ذاتِ بشریت کا طرہ امتیاز ہے وہ میرے مالک سے سب سے زیادہ قریب اور اس کا محبوب ترین بندہ ہے۔ اس کی محبّت و عقیدت کے جذبات مجھے مجبور کر رہے ہیں کہ میں اُس کی بارگاہ میں حاضری دوں۔ اور اس انسانِ اوّل کی زیارت کروں جس کی اطاعت خدا کی اطاعت ہے ...

قرآن مبین

میں دیکھتا ہوں ـــــ انسانوں کے تصرّف میں آنے والی کوئی چیز آلودگیوں سے محفوظ نہیں ہے ـــــ ہوائیں آلودہ، غذائیں آلودہ، پانی آلودہ، دوائیں آلودہ ـــ ہر چیز میں ملاوٹ، ہر شے مخلوط کہیں کوئی چیز خالص نہیں ـــ ادب میں سیاست، سیاست میں گھٹالہ، تجارت میں فریب کاری، شاعری میں دلالی، خطابت میں اداکاری، مذہبیات میں ایجادِ بندہ کی آمیزش ـــ حد ہے کہ حدیثوں میں جعلی حدیثیں، تفسیروں میں جھوٹی روایتیں، تاریخ میں من گھڑت افسانے، روایات میں اسرائیلیات مخلوط ہو چکے ہیں۔

صرف اور صرف اللہ کی یہ آخری کتاب یعنی قرآن ہے جو ہر طرح کی آلودگیوں سے پاک ہے، اس میں نہ باطل آگے سے آسکتا ہے نہ پیچھے سے ـ ہر عیب و ریب سے محفوظ ـ انسانی طاقت سے باہر ہے کہ اس میں کسی طرح کی ملاوٹ کی جا سکے۔ کیونکہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ کے ذمّے ہے۔

- "ہمیں نے قرآن نازل کیا ہے اور ہمیں اس کی حفاظت کریں گے"۔ (سورۃ الحجر ۹)

اگر قرآن نہ ہوتا تو آلودگیوں سے بچنے کا ہمارے پاس کوئی راستہ نہ تھا ـــــ یہی معیار ہے اور یہی میزان ہے، یہی حق کو باطل سے الگ کرنے والا "فرقان" ہے ـــــ یہی حقیقتوں کو واضح کرنے والا "بیان" ہے۔ یہی حجّت تمام کرنے والا "برہان" ہے۔

یہی آنکھیں کھولنے والا "تبصرہ" ہے، یہی دلوں کے لئے "شفاء" اور دماغوں کے لئے "ضیا" ہے ـــــ تشکیک و شبہات کے اندھیروں سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہی وہ اکیلا "چراغ" ہے جو ہمیں منزل مقصود تک پہونچا سکتا ہے۔ اگر قرآن سے رشتہ ٹوٹ گیا تو سب کچھ اندھیروں میں کھو جائے گا۔

اس لئے میری عقل فیصلہ کرتی ہے کہ میں اپنے ہر سفر کی ابتدا قرآن سے کروں۔ جب تک اس کی انگلی نہ تھام لوں قدم نہ اٹھاؤں خطِ یقین تک پہونچنے کے لئے نقطۂ یقین سے آغاز سفر ضروری ہے شک سے شک کی طرف پیش قدمی عقلاً جائز نہیں۔ ـ ایک لمحے کے لئے بھی قرآن سے جدا ہونا مجھے گوارہ نہیں ـــــ میں نے طے کر لیا ہے کہ ہر شے کو اسی کسوٹی پر پرکھوں گا۔ ہر چیز کو اسی میزان میں تولوں گا۔ ہر چہرہ اسی آئینے میں دیکھوں گا ـــ اس کی اجازت کے بغیر نہ انکار کروں گا نہ اقرار ـــــ نہ ترک نہ اختیار ـــــ یہ جہاں لے جائے گا جاؤں گا۔ جہاں منع کر دے گا قدم نہ بڑھاؤں گا یہ جسے اپنائے گا اپناؤں گا، جسے ٹھکرا دے گا ٹھکرا دوں گا۔ جسے اچھا کہے گا اسے اچھا سمجھوں گا۔ جسے برا کہے گا اسے برا سمجھوں گا۔ جس دروازے پر پہونچا دے گا، پہونچ جاؤں گا۔ جس سے سوال کرنے کی اجازت دے گا اس سے سوال کروں گا۔ جس سے مانگنے کا حکم دے گا اس کے سامنے دست طلب دراز کروں گا۔ جس زندگی کو اسوۂ حسنہ قرار دے گا اسے اپنے لئے رہبر و رہنما بنا لوں گا ـــــ اور مجھے یقین ہے کہ قرآن مجھے کہیں تنہا نہ چھوڑے گا۔ زندگی کے الجھے ہوئے کسی مسئلہ میں خاموش نہیں رہے گا۔ کسی سوال پر چپ نہیں رہے گا ـــــ یا خود بتائے گا یا کسی بتانے والے کی نشاندہی کرے گا۔ اس لئے کہ اس کے دامن میں

ہر سچائی سمٹی ہوئی ہے۔ ـــــــــــــــــ

ـــــــ مگر سوال یہ ہے کہ کیا میں قرآن کو سمجھ سکتا ہوں؟ کیا اس سے ہدایت حاصل کر سکتا ہوں؟ کیا میرے جیسے جاہل انسان کے لئے قرآن کے مفاہیم تک رسائی ممکن ہے؟ کیا قرآن سے میرا تعلق بس تلاوت برائے تلاوت تک محدود ہے؟ کیا قرآن میرے لئے بس ایک "تبرّک" ہے کہ بوسہ دے کر احترام کے غلاف میں لپیٹ دوں؟

نہیں ایسا نہیں ہے! قرآن پوری وضاحت سے مالک کی طرف سے اعلان کر رہا ہے بلکہ ایک ہی سورے میں چار بار اس اعلان کی تکرار کر رہا ہے۔

- "ہم نے قرآن کو نصیحت کے لئے آسان کر دیا ہے۔ (سورہ قمر ۱۷، ۲۲، ۳۲، ۴۰)

اس لئے مجھے یقین ہے کہ قرآن کا سمجھنا میرے لئے دنیا کے ہر کلام سے زیادہ آسان ہے۔ یہ میرے اس مالک کا کلام ہے جو میری رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے۔ جو میری قوّتِ فہم و ادراک سے با خبر ہی نہیں اس کا پیدا کرنے والا بھی ہے۔ یقیناً وہ آقا اپنے غلام سے ایسی زبان میں گفتگو نہیں کر سکتا جو اس کے لئے ناقابلِ فہم ہو۔

اس لئے میری عقل فیصلہ کرتی ہے کہ اللہ نے ایسے اسلوب میں گفتگو کی ہے جو ہر اسلوب سے زیادہ آسان ہے اور اس زبان کا انتخاب کیا ہے جو تمام دنیا کی زبانوں میں سب سے زیادہ غیر پیچیدہ ہے۔

- "ہم نے اسے واضح عربی میں اس لئے نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ سکو۔ (سورہ یوسف ۲)

اگر میں اس کائنات کو سمجھ سکتا ہوں تو قرآن کو کیوں نہیں سمجھ سکتا؟ مالک کا عمل سمجھ میں آتا ہے تو مالک کا قول کیوں نہ سمجھ میں آئے گا ــــــ اگر کوئی کہتا ہے کہ "قرآن"

تمہارے سمجھنے کے لئے نہیں ہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ سورج کی روشنی سے تم فائدہ حاصل نہیں کر سکتے۔ اس کا اجالا تمہاری آنکھوں کو کوئی فیض نہیں پہونچا سکتا۔ اس کی حرارت کا تعلق براہ راست تم سے نہیں۔

یقیناً میں نہ تمام اسرارِ کائنات کو اپنی گرفت میں لے سکتا ہوں نہ تمام رموزِ قرآنی پر عبور حاصل کر سکتا ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ زمین کی تہوں میں کیا چھپا ہوا ہے؟ مگر کنواں کھود کے پانی نکال کے اپنی پیاس بجھا سکتا ہوں۔ مجھے نہیں معلوم کہ حرارت کہاں سے پیدا ہوتی ہے کس درجہ پر پہونچ کر آگ بنتی ہے ایندھن کی ماہیت کیا ہے؟ مگر آگ میں روٹی سینک کے اپنا پیٹ بھر سکتا ہوں۔

تخم ریزی کرتا ہوا کسان جو بیج اپنے ہاتھ میں لئے ہے کیا اس کے مفہوم سے ناواقف ہے؟ نہیں ایسا نہیں ہے۔ وہ جانتا ہے کہ بیج زمین کی نمی پا کے پودا بنے گا پھر درخت بنے گا پھر اس میں پھل آئیں گے۔ پھر وہ اس سے اپنا اور اپنے بچّوں کا رزق حاصل کرے گا ــــــ مگر وہ نہیں جانتا کہ ننھّے سے اس بیج میں پورا درخت کیا درختوں کی پوری نسل کس طرح محفوظ ہے؟ اسے نہیں معلوم کہ اس کی کاشت کے ذریعہ پیدا ہونے والے پھل میں "حیاتین" کی تعداد اور "پروٹین" کی مقدار کیا ہے؟ یعنی وہ بہت کچھ نہ جاننے کے باوجود بہت کچھ جانتا ہے ــــــ اسی طرح کائنات ہو یا قرآن بیّنات وہاں بھی ہیں یہاں بھی مُتشابہات وہاں بھی ہیں یہاں بھی ــــــ یہ صحیح ہے کہ میں قرآن کا سب کچھ نہیں سمجھ سکتا مگر یہ بھی غلط ہے کہ میں کچھ بھی

نہیں سمجھ سکتا ــــــ اگر یہ صحیح ہوتا کہ میں قرآن سے اپنی ذمہ داریوں کا پتہ نہیں لگا سکتا۔ اس سے ہدایت نہیں حاصل کر سکتا۔ اس سے حکم الٰہی نہیں معلوم کر سکتا۔ اس کے مفہوم تک رسائی ممکن نہیں تو قرآن مجھے آواز کیوں دیتا؟ مجھ سے اپنی اطاعت کا مطالبہ کیوں کرتا۔ اپنے آیات میں غور و فکر کی دعوت کیوں دیتا؟ اپنے سہل ہونے کا اعلان کیوں کرتا؟ ــــــ قرآن میرے مالک کا کلام ہے وہ مجھ سے مخاطب ہے۔ میں نہ سمجھوں گا تو کیا شجر و حجر سمجھیں گے ــــــ یہ ہدایت نامہ ہے تعویذ نہیں۔ قرآن ہے چیستاں نہیں۔

ــــــ مگر یہیں ایک دوسرا سوالیہ نشان بھی میرے سامنے ہے۔ میں جو عربی زبان سے ناواقف ہوں۔ اصل متن قرآن کا سمجھنا میرے لئے ممکن نہیں ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ اِنَّ اور اَنَّ میں کیا فرق ہے؟ مجھے نہیں پتہ کہ لَمۡ اور لَنۡ کا طریقہ استعمال کیا ہے؛ میں نہیں جانتا کہ اعراب بدل جانے سے مفہوم میں کتنی تبدیلی ہو جاتی ہے ــــــ؟ کیا میں ترجموں کے ذریعہ قرآن کے مفہوم تک رسائی نہیں حاصل کر سکتا؟ کیا ترجموں کے ذریعے غور و فکر کرکے قرآن فہمی کی کوشش میرے لئے جائز نہیں؟

یقیناً کسی کلام کو اس کی اپنی زبان میں سمجھنا، فہم و ادراک کی جس سطح پر پہونچا سکتا ہے وہاں ترجموں کے ذریعہ نہیں پہونچا جا سکتا۔ یقیناً قرآن سے وابستگی کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے اسی زبان میں سمجھنے کی کوشش کی جائے جس میں نازل ہوا ہے۔ مگر ترجموں کے ذریعہ آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کرنے کا حق غیر عربی دانوں سے سلب نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن اُن پر بھی اپنے مفہوم کھولتا ہے جو اصل متن کو ذریعہ بناتے ہیں اور انہیں بھی ہدایت عطا کرتا ہے جو ترجموں کو ذریعہ بناتے ہیں۔

دنیا میں فلسفہ، سائنس، ریاضیات وسماجیات کی سیکڑوں کتابیں ایک زبان سے دوسری زبان میں منتقل ہو رہی ہیں اور ترجموں کے ذریعے سمجھی جارہی ہیں۔ — تو پھر مالک کا کلام اس فطری طریقہ تفہیم سے محروم کیوں؟ سمجھنے والے تو گونگوں کی بھی بات سمجھ لیتے ہیں۔ قرآن تو مالک کا کلام ہے۔ فطرت کی آواز کسی بھی زبان میں سنی جائے اجنبی نہیں ہو سکتی۔

کچھ دن پہلے ایک بالکل ان پڑھ سے مسجد میں ملاقات ہوئی جسے کبھی بچپن میں دیکھا تھا۔ اب جو دیکھا تو اس کا داہنا ہاتھ کسی حادثے کی نذر ہو چکا تھا از راہِ ہمدردی میں نے کہا کہ بھائی! ایک ہاتھ سے محرومی تمہارے لئے بڑی زحمتوں کا سبب ہوگی! اُس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا "ہر حال میں وہی پالنے والا ہے"۔ — اور میں سوچنے لگا کہ بڑے سے بڑا عرب "ربّ العالمین" کا مطلب اس سے زیادہ کیا سمجھ لے گا۔

قرآن فہمی کے لئے اللہ نے نہ کسی درسگاہ کو معیار بنایا ہے نہ زبان دانی کی کسی ڈگری کو — اس نے پوری وضاحت سے جن شرائط کو لازمی قرار دیا ہے وہ تقویٰ، غور وفکر اور عقل سے کام لینا ہے — قرآن بار بار اعلان کرتا ہے کہ اس کی آیات کو خوفِ خدا رکھنے والے، غور وفکر کرنے والے اور عقل سے کام لینے والے ہی سمجھ سکتے ہیں۔ یہاں نہ عربی دانی کام آتی ہے نہ صرف و نحو پر عبور — ورنہ کیا وجہ تھی کہ ابو لہب اور ابوسفیان جیسے عرب نژاد قرآن سے کچھ نہ حاصل کر سکے — سلمانِ فارسی اور بلالِ حبشی جیسے عجمیوں نے سب کچھ پا لیا۔

تفسیر بالرائے کا فتنہ وہیں سر اٹھاتا ہے جہاں خوفِ خدا نہیں ہوتا۔ غور وفکر

اور عقل سے کام نہیں لیا جاتا ـــــ ورنہ اللہ کی کتاب آپ اپنی معلّم بھی ہے اور آپ اپنا لغت بھی۔ فکر کو روشنی بھی عطا کرتی ہے اور فکر کو انحراف سے بچاتی بھی ہے اس لئے میں نے طے کر لیا ہے کہ جہاں متن پڑھ کے بات نہ سمجھ میں آئے گی وہاں ترجموں کے سہارے قرآن سے ہدایت حاصل کروں گا۔

اب ایک تیسرا سوال بھی میرے سامنے ہے۔

اس بات کا یقین کیسے حاصل ہو کہ میں نے وہی سمجھا ہے جو قرآن سمجھانا چاہتا ہے؟ ہو سکتا ہے قرآن کچھ اور کہہ رہا ہو اور میری سمجھ میں کچھ اور آیا ہو ـــــ ہو سکتا ہے میری سمجھ غلط فہمی کا شکار ہو جائے اس لئے کہ قرآن ہر عیب و ریب سے پاک ہے میری عقل تو نہیں! قرآن قطعی ہے میری سمجھ تو معصوم نہیں۔

تو پھر کیا کروں ـــــ؟ قرآن کو جزدان میں لپیٹ کے رکھ دوں اور صرف حدیثوں کا دروازہ کھٹکھٹاؤں؟ مگر اس راستے میں تو دُوہرا خطرہ ہے ۱۔ ہو سکتا ہے کہ یہ حدیث نہ ہو کسی جعلساز کا قول ہو ۲۔ ہو سکتا ہے کہ حدیث کا وہ مفہوم سمجھ میں آئے جو منشائے پیغمبر اور مرضیٔ معبود کے خلاف ہو۔ نہیں میری عقل راضی نہیں کہ ایک خطرے سے بچنے کے لئے دو خطرات میں گرفتار ہو جاؤں۔ نہ میری عقل اس بات پر راضی ہے نہ قرآن اس کی اجازت دیتا ہے ـــــ وہ تو مجھے بار بار آواز دے رہا ہے ـــــ کہ میں تمہارے لئے بھیجا گیا ہوں! مجھے سمجھو! میری ہدایت پر عمل کرو مجھے "قطعیُّ الدّلالہ" اور "ظنیُّ الدّلالہ" جیسی بوجھل اصطلاحوں کے استعمال کا ہنر نہیں آتا۔ مگر اتنا جانتا ہوں کہ اللہ کی کتاب بھی قطعی ہے اور قرآن کے احکام کے بارے میں میری عقل کا فیصلہ بھی قطعی ہے ـــــ مجھے

انہیں فیصلوں پر عمل کرنا ہے ــــــ اس لئے کہ یہی تقدیر الٰہی ہے اور یہی مرضیِ پروردگار۔

قرآن نہ سمجھنے کا وسوسہ کسی شیطان کا پیدا کیا ہوا ہوگا۔ ورنہ اللہ کے نیک بندے ہمیشہ اسی کے آگے ہاتھ پھیلاتے ہیں، سوال کرتے ہیں اور صحیح جواب حاصل کر لیتے ہیں نہ قرآن "ظنّی" ہے نہ اس کا دیا ہوا جواب۔ کیونکہ یہ کسی شاعر کا پھیلا ہوا "حلقۂ خیال" نہیں ہے کہ آگہی کو دام شنیدن بچھانا پڑے ــــــ یہ آقا کی گفتگو ہے جو اپنے غلاموں سے مخاطب ہے۔

البتہ جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھا پن ہے ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آئے گا۔ قرآن انہیں کیڑوں مکوڑوں سے بھی بدتر سمجھتا ہے۔ قرآن کیا ایسے لوگ تو نہ کائنات کو سمجھ سکتے ہیں نہ اپنی ذات کو۔ بلکہ کبھی کبھی تو ان کی سمجھ میں ماں بہن کے رشتے بھی نہیں آتے ــــــ قرآن نہ ان سے گفتگو کرتا ہے نہ انہیں اپنی درسگاہ میں داخلے کی اجازت دیتا ہے۔

اس طرح کے احمقانہ سوالات اسلامی فکر سے مطابقت نہیں رکھتے کہ قرآن میں یہ کہاں لکھا ہے اور وہ کہاں لکھا ہے؟ دیکھنے والی نگاہیں ہوں تو سب کچھ لکھا ہے۔ عقل کے اندھے تو اتنی بڑی کائنات میں اپنے مالک کی ربوبیّت کا بھی مشاہدہ نہیں کر پاتے ــــــ دنیا کا کوئی حکم یا خبر اجمال سے خالی نہیں مفہوم کے تمام تفصیلات کو لفظوں کی ظاہری سطح پر اکٹھا کر دینا ممکن نہیں۔ بہت کچھ سننے والے کے ذہن میں محفوظ ہوتا ہے اور بہت کچھ ان افراد سے معلوم کر لیتا ہے جو تفصیلات سے باخبر اور اسے بتانے کے ذمّہ دار ہوتے ہیں۔

بارگاہِ رسالت میں

وہ افسانوی دور کا کوئی اساطیری کردار نہیں ـــــ بلکہ تاریخ کی کھُلی آنکھوں نے اُس کا بچپن بھی دیکھا ہے اور جوانی بھی، گلّہ بانی کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے اور حکمرانی کرتے ہوئے بھی اسے اُس وقت بھی دیکھا ہے جب وہ بھوک کی شدّت کم کرنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے تھا، اور اُسے اُس وقت بھی دیکھا جب مستکبرین کے تاج اُس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے۔ اُسے سفر میں بھی دیکھا اور حضر میں بھی، باہر بھی دیکھا ہے گھر کے اندر بھی۔ میدان جنگ میں بھی دیکھا ہے محفل صلح میں بھی دوستوں میں بھی دیکھا ہے دشمنوں میں بھی۔ محراب میں بھی دیکھا ہے منبر پر بھی۔ تجارت کرتے ہوئے بھی دیکھا ہے، زراعت کرتے ہوئے بھی۔

مؤرخین نے اُس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قلم بند کر لیا ہے۔ اُس کی زندگی کے تفصیلات اُس کے اپنوں نے بھی محفوظ کر رکھے ہیں اور غیروں نے بھی۔ اُس کی حیات کا کوئی حصّہ تاریکی میں نہیں چھپا ہوا ہے کیونکہ وہ بیک وقت لاکھوں لوگوں کا مرکزِ نگاہ بنا ہوا تھا ـــ دوست اپنی نگاہوں سے اس لئے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے کہ اُس کے کردار و اخلاق سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کریں۔ اور دشمن اپنی نگاہوں سے اس لئے نہیں دور ہونے دینا چاہتے تھے کہ شاید کردار کا کوئی کمزور پہلو ہاتھ لگ جائے۔

پھر ایسی شخصیّت کے بارے میں صحیح فیصلہ کرنا ناممکن نہیں ـــ تمام تاریخی

دستاویزات میرے سامنے ہیں آثار و قرائن موجود ہیں بلا لحاظ مذہب و ملّت "زبانِ خلق" کے متفقہ بیانات میرے کانوں سے ٹکرا رہے ہیں۔

میں کسی رُشدی کی طرح "ناول نگاری" نہیں بلکہ ایک انصاف پسند جج کی طرح منطقی فیصلہ کرنا چاہتا ہوں۔ میری نظروں میں واقعی اور تاریخی کرداروں کو افسانوی کردار بنانے کی کوشش کسی زندہ انسان کو قتل کرکے مردوں کی فہرست میں ڈال دینے سے بڑا جرم ہے۔ منطقی توجیہ کے ساتھ کسی کے دعوے کا انکار کوئی جرم نہیں بلکہ ایک اخلاقی عمل ہے مگر "ادب اور آرٹ" کے پردے میں کسی سنجیدہ موضوع کا مذاق اڑانا، "شریر النفسی" ہے۔ اس لئے کہ ادب اور آرٹ کا کام کائنات اور انسان کے وجود میں پھیلے ہوئے کمال و جمال کی عکاسی ہے۔ انکارِ حق نہیں۔

"تمثیلی ظرافت" کی کمیں گاہوں میں بیٹھ کر حقائق پر تیر اندازی میرے نزدیک کمینہ خصلتی ہے۔ ایسی حرکتیں انسان کو انسانیت کی سطح سے گرا کے شیطانوں کی صف میں کھڑا کر دیتی ہیں۔

میں اس کے بارے میں افسانوں کا نہیں تاریخ کا فیصلہ معلوم کرنا چاہتا ہوں مسلم و غیر مسلم یہودی اور عیسائی راویوں سے پوچھتا ہوں وہ کیسا تھا؟ مجھے جواب ملتا ہے۔

امانت و صداقت، عزم و شجاعت، اخلاق و محبّت کے سانچے میں ڈھلا ہوا کردار پہاڑوں کی طرح ناقابلِ تسخیر تھا، حالات بدلتے رہے مگر کردار میں تضاد نہ پیدا ہوا ماحول تبدیل ہوتا رہا مگر مزاج میں تبدیلی نہ آسکی۔ یتیمی کا دور ہو یا غربت کا زمانہ ہمسندِ اقتدار ہو

یا دشمنوں کا نرغہ، کہیں بھی خطِ صداقت سے بال برابر پیچھے ہٹنے کا ارادہ بھی نہ کیا امین و صادق کا خطاب دینے والوں نے پتھر برسائے، اس کی سچائی کی قسم کھانے والوں نے شاعر، مجنوں، اور جادوگر کہا مگر وہ نہ جذباتی ہیجان کا شکار ہوا نہ اعصابی تناؤ میں مبتلا ہوا۔ حادثے اس کے مزاج میں انتشار نہ پیدا کر سکے اعلانِ نبوّت سے پہلے قبائل پرستی کے متعصّب ترین ماحول میں اس کی تمام برائیوں سے کنارہ کش رہتے ہوئے ہر قبیلے کا ہر دل عزیز بنا رہا۔

چالیس سال تک ــــ نہ کبھی افسانہ طرازی کی نہ داستان گوئی سے دلچسپی لی، نہ اسے شعروشاعری کا شوق تھا نہ فلسفیانہ موشگافیوں کا ذوق تھا، نہ خطیبانہ لفّاظی کی عادت تھی، نہ اُس نے کبھی اپنی ذہانت وقابلیت کا دعویٰ کیا، نہ اُس کی کسی گفتگو نے تخلیقی ذہن کی غمّازی کی، چالیس سال عمر گذارنے کے بعد ایک دن اعلان کر دیا ــــ میرے "رب" نے انسانوں کی ہدایت کے لئے مجھے رسالت کی ذمّہ داری سونپی ہے۔

اب میں عقل ووجدان سے سوال کرتا ہوں کہ ــــ کیا میرا رب میری ہدایت کے لئے کسی انسان کو پیغامبر نہیں بنا سکتا؟ مجھے جواب ملتا ہے۔ وہ قادر مطلق ہے اگر چاہے تو پتھروں کو قوّتِ گویائی اور درختوں کو زبان عطا کر دے۔ اسے کون روک سکتا ہے؟

میں دوسرا سوال کرتا ہوں ــــ کہ مالک کی پیغمبری کے منصب دار کو کیسے کردار کا حامل ہونا چاہئے۔ مجھے جواب ملتا ہے "ہم رسالت کی ذمّہ داری پوری کرنے والے کے لئے محمّد عربی" سے بہتر کسی کردار کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے۔

آج کے رشدی ہوں یا کل کے ابولہب وابوجہل ـــــ کسی منطقی بنیاد کے بغیر ساحر، مجنوں، شاعر، یا ہوس پرست ہونے کا الزام لگانا شیطنت نہیں تو اور کیا ہے؟ ایسے الزامات لگانا اس نفسِ خبیث کی گواہی دیتا ہے جو انسانی پیکر میں چھپ کے انسانیت کو تباہ کرتا رہا ہے۔

کیا وہ ساحر تھا؟

مجھے نہیں معلوم کہ ساحر کہنے والوں کے ذہن میں سحر کا کیا مفہوم تھا، مگر میں نے بچپن میں بڑی بوڑھیوں سے جادو اور جادوگروں سے منسوب جو کہانیاں سنی تھیں اس میں یہی سنا تھا کہ ساحر کے مرتے ہی اس کا سحر بھی مر جاتا ہے۔ مگر وہ کیسا ساحر تھا کہ چودہ سو سال پہلے دنیا سے جا چکا ہے مگر اس کا "سحر" اسی طرح زندہ ہے بلکہ عرب سے نکل کے پوری دنیا کو اپنے حلقے میں لے چکا ہے ـــــ لاکھوں مسجدوں سے روزانہ اُس کی عظمت کی اذان دی جا رہی ہے۔ مدرسوں میں اس کے نام کا کلمہ پڑھا جا رہا ہے، اس کے لبوں سے نکلا ہوا ہر لفظ کروڑوں انسانوں کے لئے سرمایۂ حیات بنا ہوا ہے۔ آخر اس کا طلسم ٹوٹتا کیوں نہیں؟

مجھے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ ساحر نہیں تھا۔

کیا وہ شاعر تھا؟

اگر وہ شاعر تھا تو اُس نے دعوائے رسالت سے پہلے کتنے شعر کہے تھے؟ کتنے قصیدے اور مرثیے لکھے تھے؟ چالیس سال کی عمر تک اُس کے معاشرے کے کسی فرد نے اسے شاعر کیوں نہیں کہا؟ اُس کا کوئی شعر عربی شعریات میں کیوں نہیں شامل کیا گیا؟ اُس نے بچپن سے جوانی تک شعروشاعری سے کوئی دلچسپی کیوں نہیں لی؟ اُس نے لکھنا پڑھنا بھی نہیں سیکھا تھا کہ ادبیاتِ عالم کا مطالعہ کرتا، پھر راتوں رات

وہ اتنا بڑا شاعر کیسے بن گیا کہ اس کے کسی فقرے کا جواب نہ کل ممکن تھا نہ آج ممکن ہے
قرآن اگر شاعری ہے تو اس کا طرز نگارش اپنی مثال آپ کیوں ہے؟ اس قسم کے کلام کا وجود پہلے کہیں کیوں ثابت نہیں ہوتا؟ اور بعد میں اس کا "تتبع" کوئی کیوں نہیں کرسکا؟ —— قرآن کو شاعری کی کوئی قسم تسلیم کرلینے کا کوئی ثبوت میرے پاس نہیں ہے

کیا وہ دیوانہ تھا؟

کیا دیوانے ایسے ہی ہوتے ہیں کہ اربوں انسانوں کو اپنا دیوانہ بنالیں اور وہ بھی اس طرح کہ کروڑوں انسان کل بھی اس کی آواز پر جان دینے کے لئے تیار تھے اور آج بھی تیار ہیں —— کیا چند برسوں میں صدیوں سے پھیلے ہوئے رسم ورواج کی جڑوں کو اکھاڑ کے پھینک دینا دیوانگی ہے۔ کیا مختصر ترین مدّت میں معاشرے کو اخلاقیات کے نقطۂ صفر سے اٹھا کے عظمتِ کردار کی بلندی پر پہونچا دینا دیوانگی ہے؟ کیا نسل ورنگ اور ملک ووطن کی دیواروں کو گرا کے صرف اللہ کی بندگی کی بنیاد پر ایک نئے معاشرے کی تشکیل دیوانگی ہے؟ باہوش انسانوں کا ذکر کیا یہ الزام تو دیوانے بھی نہیں لگا سکتے۔

کیا وہ ہوس پرست تھا؟

۲۵ سال تک مجرّد مگر پاک و پاکیزہ زندگی گذار کے اپنی عمر سے بڑی خاتون سے رشتۂ ازدواج قائم کرلینا ہوس پرستی ہے؟ اُس کی زندگی کا کوئی ایسا واقعہ تاریخ کیوں نہیں بتاتی جس پر ہوس پرستی کا لیبل لگایا جاسکے؟ کیا اُس کے معاصرین نے کبھی اُس پر ہوس پرستی کا الزام عاید کیا ہے؟ کیا اُس نے اپنے رہنے کے لئے عالی شان محل بنوائے تھے؟ کیا وہ بہترین غذاؤں اور قیمتی ملبوسات کا عادی تھا؟ کیا تاریخ یہی کہتی ہے؟ —— نہیں! تو پھر کیا کھجوروں

کے پتّوں سے بنے ہوئے جھونپڑے میں زندگی گذار دینا ہوس پرستی ہے؟ فاقوں میں زندگی بسر کرنا ہوس پرستی ہے؟ ٹوٹی ہوئی چٹائی پر راتیں گذارنا ہوس پرستی ہے؟ ابتلاؤ آزمائش کے موقع پر خود اپنی گود کے پالوں کو سب سے آگے رکھنا ہوس پرستی ہے؟ کھردری اور برہنہ زمین پر بیٹھ کر حکومت کے فیصلے کرنا ہوس پرستی ہے؟ دامن جھاڑ کے دنیا سے رخصت ہو جانا ہوس پرستی ہے؟

عقل و منطق کی بزم میں کوئی جگہ نہیں جہاں بیٹھ کے اس پر ہوس پرستی کا الزام لگایا جا سکے۔

وہ ساحر نہیں تھا، وہ جادوگر نہیں تھا۔ وہ شاعر نہیں تھا —— تو پھر وہ کیا تھا؟

آخری بات جو سوچی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک عظیم اور کامیاب مصلح تھا۔ اُس نے انسانیت کی بھلائی کے لئے مستضعفین و محرومین کی بہبود کے لئے اپنی قوم کو جہالت و خونریزی کے اندھیروں سے نکالنے کے لئے اور اخلاق و کردار کی بلند ترین سطح پر پہونچانے کے لئے —— خود اپنے ہی خیالات کو ترتیب دے کے ایک مکمل قانون حیات وضع کر لیا اور اسے قرآن کے نام سے اللہ کی طرف منسوب کر دیا اور خود کو اللہ کا پیغمبر بتایا تاکہ لوگ پوری یکسوئی اور فلاح و نجات کے یقین کے ساتھ اُس پر عمل کر کے ایک کامیاب زندگی بسر کریں اور اُسے اپنے پیدا کرنے والے کا پیغام سمجھ کے "جاہلیت" تو ہمات اور بے مقصد رسم و رواج کی زنجیروں کو توڑ دیں اور شرک و کفر جیسی بیماریوں سے نجات حاصل کر لیں۔

وہ ایک ایسا "نابغہ" تھا، ایک ایسا ذہین ترین انسان تھا جس نے اپنے پروگرام میں صد فی صد کامیابی حاصل کر لی اُس نے جو سوچا وہی ہوا. جو کہا وہی سامنے آیا۔

یہی وہ تصوّر ہے جسے مستشرقین اور مغربی مفکرین بلکہ اکثر مغرب زدہ مسلم مفکرین نے کبھی دبی زبان میں کبھی کھلم کھلا پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مثلاً ایک انگریز کہتا ہے۔

"میں محمدؐ کی عظمت و بزرگی کا قائل ہوں، ان کی بزرگی ان افراد سے بڑھ کر ہے جنہیں ہم "نوابغ" سمجھتے ہیں، محمدؐ تاریخ کے ہوشمند ترین افراد سے زیادہ ہوشمند تھے۔"

مسیحی ڈاکٹر مائیکل ہارٹ نے تاریخ کے سو بڑے انسانوں پر ایک ضخیم کتاب لکھی اس میں لکھا کہ ـــــــ "تاریخ انسانی میں جو سب سے زیادہ کامیاب ہوا وہ محمدؐ صاحب تھے ـــــــ"

ڈاکٹر ٹی ڈبلو ارنلڈ نے "دعوت اسلام" کے نام سے کتاب لکھی اُس میں کہا کہ "ـــــ اسلام کی سب سے بڑی طاقت اُس کی نظریاتی طاقت ہے ـــــ"

ابھی ہندوستان کے کسی اخبار میں ایک ہندو مفکر نے لکھا ـــــ "محمدؐ صاحب دنیا کے ذہین ترین انسانوں میں تھے انہوں نے اپنی قوم کو مستحکم بنانے کے لئے خلوص اور ذہانت سے تحریک چلائی اور صد فی صد کامیابی حاصل کر لی ـــــ"

اگر میں یہ بات مان لوں، تو مجھے کہنا پڑے گا کہ ـــــ اس نے یہ پروگرام

زمین پر قدم رکھتے ہی بنا لیا تھا اور طے کر لیا تھا کہ چالیس سال تک خاموش رہ کر
ایسی زندگی بسر کرنا ہے جو امانت و صداقت، حق گوئی و حق پرستی کا اعلیٰ ترین نمونہ ہو۔
بچپن اور جوانی کو اس طرح بسر کروں گا کہ کوئی ایسا کمزور پہلو نہ پیدا ہونے پائے جو میرے
دعوائے نبوّت کو کمزور کر سکے۔ اس نے آغوشِ مادری میں اپنی پوری زندگی کا ایسا مضبوط
مستحکم اور مربوط و منظم لائحہ عمل مرتب کر لیا تھا جس میں کبھی نہ کوئی جھول پیدا ہو نہ دورنگی
نہ عمل میں تضاد پیدا ہو نہ قول میں فرق۔

اُس نے طے کر لیا تھا کہ عہدِ بلوغ میں داخل ہونے سے پہلے بھی نہ کبھی غلط بیانی
کروں گا نہ داستان گوئی۔ نہ وعدہ خلافی نہ امانت میں خیانت، بچّوں کی فطرت
کے خلاف لہو و لعب اور کھیل کود کی محفلوں سے دور رہوں گا ــــ یہاں تک کہ دعوائے نبوت
کے منکروں کو کوئی چھوٹے سے چھوٹا واقعہ بھی ایسا نہ مل سکے جو اس کے انکار کی بنیاد
بن سکے۔

قبائلی عصبیت کے ماحول میں ایسی غیر جانبدار زندگی بسر کی کہ ہر قبیلے کا ہر دل عزیز
بنا رہا۔ یہاں تک کہ پورے معاشرے نے امین و صادق کا لقب دے دیا۔
یہی نہیں بلکہ خود کو عالمِ وجود میں لانے کے لئے بہترین اصلاب و ارحام کا انتخاب
بھی کر لیا تھا اور اپنے دعوے کی کامیابی کے لئے مناسب ترین سرزمین کو بھی چُن
لیا تھا۔ علم و معرفت کی اس بلندی پر پہونچ گیا جہاں سے وہ انسانیت کے ماضی کا
بھی مشاہدہ کر رہا تھا اور مستقبل کا بھی۔ وہ بصیرت و ذہانت کی اس سطح پر پہونچ
گیا تھا جہاں کسی انسان کا پہونچنا محال ہے۔ جہاں کھڑے ہو کے وہ عالمِ طبعیات

ہی نہیں عالم معنویات میں بھی جاری اسباب و علل کے نظام کا مطالعہ کر کے ناقابلِ تردید خبریں دے رہا تھا۔ جو کہہ دیا وہ ہو کے رہا جو بتا دیا وہی سامنے آیا۔ جس عمل کو اچھا کہہ دیا اس کی اچھائی ظاہر ہو کے رہی جسے برا کہہ دیا اُس کی برائی حالات نے ثابت کر دی ــــ جب مصر کے اہراموں میں فراعنہ کی حنوط شدہ لاشیں نہیں دریافت ہوئی تھیں اُس وقت اس نے اللہ کی طرف سے اعلان کر دیا کہ ــــ

"آج ہم تیرے بدن کو بچالیں گے تاکہ بعد والوں کے لئے نشانی بنے" (یونس ۹۲)

جب علم سائنس نے آنکھیں بھی نہیں کھولی تھیں۔ اُس نے اللہ کی طرف سے کہہ دیا کہ ــــ

"ہم نے زمین سے اگنے والی چیزوں کے جوڑے (نرمادہ) پیدا کئے ہیں" (یٰس ۳۶)

اور جب زمین کی حرکت کا تصور بھی نہیں تھا اس نے خبر دی کہ ــــ

"اللہ نے تمہارے لئے زمین کو گہوارہ بنایا ہے" (طٰہٰ ۵۳)

اور جب مذہب صرف اندھی طاقتوں کے "توہم" کا نام تھا اُس نے یہ کہہ کے کہ "انسان زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے" انسانی فکر کا رُخ موڑ دیا۔

حیات و کائنات کے بارے میں ایسے نظریات پیش کر دیے کہ زمانہ جن کی تائید کرتا چلا جا رہا ہے اور یہ سب کچھ اس نے اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کیلئے کر لیا۔ اپنے اندر اعلیٰ ترین صفات اور بلند ترین ذہنی و روحانی قوتیں پیدا کر لیں ــ کیا کوئی انسان اپنے ارادہ و اختیار سے ایسا کر سکتا ہے؟ کیا دنیا کی ساری سچائیوں کو "جھوٹ" کے دامن میں جمع کیا جا سکتا ہے؟ کیا کذب کی بنیاد پر ایسے بے داغ کردار

کی تخلیق ہو سکتی ہے جو تمام اخلاقی عیوب، گمراہیوں، غلط کاریوں، اور انسانی کمزوریوں سے صد فی صد محفوظ ہو؟ ـــــ نہیں میری عقل ایک لمحہ کے لئے بھی تیار نہیں کہ اس کے ایک دعوائے نبوّت کو جھٹلانے کے لئے لاکھوں احمقانہ جھوٹ کا سہارا لے۔ ـــــ آخر میں کیسے کہہ دوں کہ علم و عمل، دین و دیانت، اخلاق و شرافت حق و صداقت ایثار و قربانی سے مزیّن انسانی کردار کا یہ عظیم منارہ جھوٹ اور کذب کی بنیاد پر قائم ہوا تھا؟ اگر کوئی شخص مجھ سے کہے یہ سیب کے درخت جو تم دیکھ رہے ہو یہ اصلاً نیم کے درخت ہیں یہ سیب کے درخت اس لئے بن گئے ہیں تاکہ سیب کے خوشبودار اور شیریں پھل پیدا کر کے انسانوں کو فائدہ پہونچا سکیں ـــــ کیا میں اس پاگل کی بات مان لوں گا؟ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ بلکہ میں پورے یقین و اطمینان کے ساتھ اعلان کرتا ہوں۔

لَا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ

اللہ میرے اس اعلان کو قبول فرمائے اور مجھے سیدھے راستے پر چلنے کی ہدایت دے ...
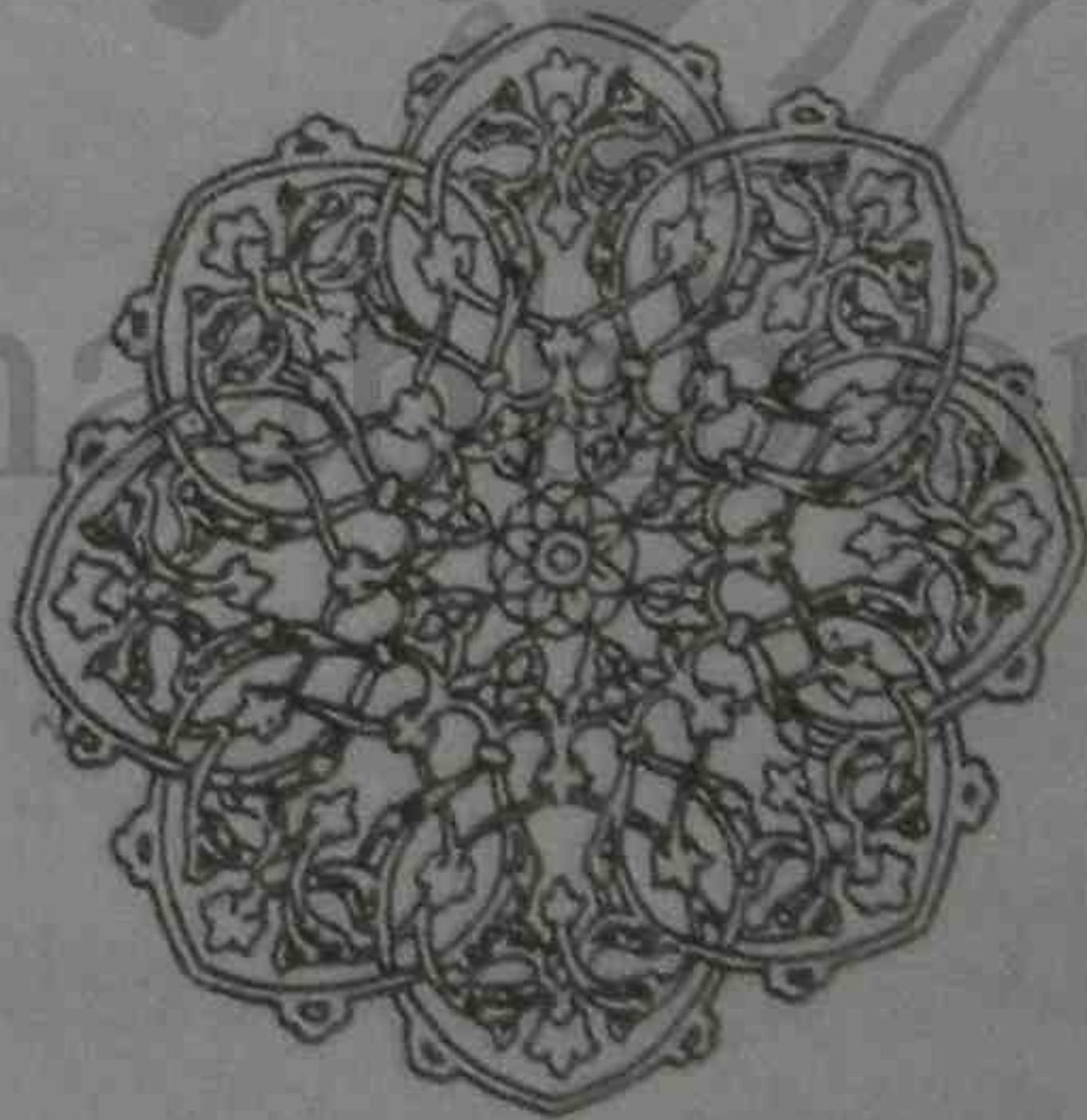
"ظلم نہیں احسان ہے"

میں سوچتا ہوں ـــــ میرے مالک نے مجھے کیوں پیدا کیا؟ مجھے میری مرضی کے بغیر منزلِ آزمائش میں کیوں کھڑا کر دیا؟ جہاں قدم قدم پر آلام و مصائب کے طوفان حملے کر رہے ہیں ـــ ابتلا و حادثات کے اس منجدھار میں میری کشتیٔ حیات کیوں ڈال دی گئی جہاں ؎

دامِ ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ
جانے کیا گذرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک

اگر وہ ہمیں نہ پیدا کرتا تو ہم دنیا و آخرت کے جھمیلوں سے محفوظ رہتے۔ نہ دنیا کی پریشانیاں نہ جہنم کا خوف۔ مگر عقل کہتی ہے تم تھے کہاں کہ محفوظ رہتے؟ ـــــ موضوع گفتگو موجود بنتا ہے۔ معدوم نہیں۔؟

میرا وجدان ایسے سوالات پر راضی نہیں ـــــ کیا کسی شاعر کا کہا ہوا شعر اس پر اعتراض کر سکتا ہے کہ تو نے مجھے کیوں پیکرِ وجود عطا کیا؟ کیا کسی نقاش کا بنایا ہوا نقش اپنے نقاش سے کہہ سکتا ہے کہ تو مجھے کیوں عالمِ وجود میں لایا۔؟

اگر ایسا ہو تو شاعر اپنے کہے ہوئے شعر سے اور نقاش اپنے بنائے ہوئے نقش سے کہہ سکتا ہے کہ ـــــ تم تھے کہاں؟ یہ تو ہماری تخلیقی صلاحیت ہے جو

تمہاری شکل میں ظاہر ہو رہی ہے، یہ تمہارا وجود ہمارے گردشِ قلم کے علاوہ کچھ نہیں۔

اسی طرح میرا مالک مجھ سے کہہ سکتا ہے ـــــ تیرے وجود کا مالک تو نہیں میں ہوں۔ یہ میری ہی قدرتِ کاملہ اور حکمتِ بالغہ ہے جو تیری شکل میں بول رہی ہے۔

زندگی کے ادراک کے لئے زندگی ضروری ہے۔ عقل کی شناخت عقل ہی سے ہو سکتی ہے۔ حکمت کو سمجھنے کے لئے حکمت کی ضرورت ہے ـــــ اس ذاتِ واجب کے ظہور کے لئے ضروری تھا کہ ایک ایسی مخلوق کو عالمِ وجود میں لائے جو، زندگی، عقل اور ارادے کی مالک ہو ـــــ تاکہ وہ اس "ازلی و ابدی زندگی، اس بے کراں عقل اور اس اتھاہ ارادے کا ادراک کر سکے جو ہر ذرے کے رگ و ریشے میں کارفرمائی کر رہا ہے۔

یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے مجھے پیکرِ وجود عطا کیا، وجود کو زندگی دی، زندگی کو عقل و شعور کا مالک بنا کے اپنی معرفت کی صلاحیت بخش دی۔

"معدوم" کو "موجود" کر دینا ظلم نہیں احسان ہے۔ یہ جائے شکایت نہیں مقامِ تشکر ہے۔ حق و ناحق کا سوال موجود کے لئے قائم ہوتا ہے معدوم کے لئے نہیں ـــــ خالق کا حق ہے کہ تخلیق کا عمل انجام دے ـــــ اور مخلوق عالمِ وجود میں آنے کے بعد ہی موضوعِ گفتگو بن سکتی ہے پہلے نہیں۔

البتہ پیدا ہونے کے بعد اگر خلقت میں نقص ہو یا اس کے ساتھ ظلم اور

زیادتی سے کام لیا جائے تو فریاد کا حق ہے ـــــ مگر انسانی خلقت کے بارے میں اس مالک و آقا نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے کہ:

★ ہم نے انسان کو بہترین خلقت پر پیدا کیا۔ (۹۵-۴)

★ اس کے ساتھ ذرّہ برابر ظلم نہیں کیا جائیگا۔ (بقرۃ-۲۸۱)

ـــــ ۵ ـــــ

یقیناً میرے چاروں طرف آلام و مصائب کا ہجوم ہے۔ مجھے سردی بھی پریشان کرتی ہے اور گرمی بھی، بیماریاں بھی اذیت دیتی ہیں اور حادثے بھی، مجھے درندے بھی تکلیف پہونچاتے اور زہریلے جانور بھی۔ طوفان بھی میرے دشمن ہیں اور زلزلے بھی۔ بجلیاں بھی میری تباہی کے درپے ہیں اور سیلاب بھی ـــــ مگر اس لئے کہ میں زندہ ہوں، باشعور ہوں اور ہوش اور حواس کا مالک ہوں۔

اگر پتھروں کی طرح بے جان ہوتا، بے حس ہوتا، بے شعور ہوتا تو مجھ پر نہ موسم کا اثر ہوتا نہ زہریلے جانوروں کا، نہ بیماریوں کا نہ سردی اور گرمی کا۔

مگر میں یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ، عدم وجود سے بہتر ہے۔ بے حسی شعور سے افضل ہے۔ جہل علم سے برتر ہے۔

یہ اس کا کرم ہے کہ اس نے زندگی عطا کر دی، عقل سے سرفراز کیا، سوچنے سمجھنے کی صلاحیت دی اور حواس کا مالک بنا دیا ـــــ میرے پاس وہ عقل نہیں جو کرم کو ظلم سے تعبیر کرے۔

کیا ایک مرتے ہوئے مریض کو اپنے علاج کے ذریعے موت کے منھ سے نکال کے پھر اسی آلام و مصائب سے لبریز زندگی کی محفل میں واپس لانے والا ڈاکٹر ظالم ہے ؟ —— کیا کسی بے ہوش کو ہوش میں لا کے اسمیں درد و الم، تکلیف و اذیت کے احساسات کو بیدار کر دینا جرم ہے ؟۔ کیا بچے کو اسکول میں داخل کر کے اس کے لئے طرح طرح کی پریشانیاں ایجاد کرنا ظلم ہے ؟ کہ اب اسے سبق یاد کرنا ہوگا، مدرس کی تنبیہ برداشت کرنا پڑیگی، اساتذہ کی ڈانٹ سننا ہوگی، پڑھنے لکھنے کی پابندیوں سے گذرنا ہوگا۔ پھر امتحان کے مرحلوں سے مقابلہ، امتحان میں ناکامی کا خوف —— اور پھر اس کے بعد بھی جاہل جہاں چین کی نیند اور خوابِ غفلت کے مزے لے رہا ہوگا —— وہاں عالم یہ کہتا ہوا دکھائی دے سکتا ہے ؎

اے روشنئ طبع تو بر من بلا شدی

یقیناً عقل و دانش کی روشنی، نشاطِ فکر کے ساتھ اضطراب کا سبب بھی بنتی ہے۔ اسے خوابِ غفلت کا مزا نہیں لینے دیتی —— مگر یہی روشنی انسانیت کا سرمایۂ امتیاز ہے۔

اگر یہ اسکول، یہ کالج جو بچوں کو بے خبری، بے حسی، اور جہالت کے اندھیروں سے نکال کے، علم و احساس کی روشنی میں کھڑا کر دیتے ہیں۔ بچوں پر ظلم نہیں کرتے تو زندگی اور ادراک کی دولت عطا کرنے والے مالک پر اعتراض کیوں کروں ؟ —— نہ عدم وجود کے برابر ہے نہ جہل علم کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

★ کہو کہ کیا جاننے والے نہ جاننے والوں کے برابر ہو سکتے ہیں (زمر ۹)

آلام و مصائب سے بھری ہوئی دنیا میرے لئے درس گاہ بھی ہے اور امتحان گاہ بھی۔ یہ میرے مالک کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اس درسگاہ میں داخلہ عطا کیا اور اس امتحان میں شامل کر لیا۔ اور امتحان میں کامیاب ہونے کی صلاحیت بھی بخش دی۔ اور اپنی کتاب کے ذریعے کامیابی کے طریقے بھی بتا دیئے اور کامیاب ہونے والوں کے لئے یقینی انعام کی خبر بھی دے دی۔

★ وَيُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ط اُولٰٓئِكَ حِزْبُ اللّٰهِ ط اَلَآ اِنَّ حِزْبَ اللّٰهِ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ○

وہ انھیں ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں رواں ہوں گی۔ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ ان سے راضی وہ اس سے راضی، یہی اللہ کا گروہ ہے اور اللہ کا گروہ ہی فلاح پانے والا ہے۔ (المجادلۃ ۲۲)

ماں کی مامتا اور باپ کی شفقتیں جب بیٹے کو پال کے جوان کر دیں اور اپنا خونِ جگر پلا پلا کے اسے زمین پر چلنے کے قابل بنا دیں تو وہ والدین کو اذیت دے اور کہے کہ تمہارا کوئی حق مجھ پر نہیں ہے۔ تم نے میری مرضی کے بغیر مجھے

کیوں پیدا کیا؟ اور کیوں میری پرورش کی؟ تم ظالم ہو!۔ تو کیا دنیا میں کوئی انسان ایسا ملے گا جس کا وجدان اور جس کا ضمیر ایسے بیٹے کو بُرا نہ کہے؟ ایسی نافرمان اولاد سے ماں باپ کہہ سکتے ہیں ۔ کہ ہم نے تجھے نہیں بلکہ ایک لائق اور صالح اولاد پیدا کی تھی اور اسے پالا تھا۔ تیرا نالائق وجود خود تیرے نفسِ شیطانی کی تعمیر ہے۔ اس کے ذمہ دار ہم نہیں۔

پھر میں اس حقیقی پیدا کرنے والے اور پالنے والے سے کیسے کہوں کہ تو نے میری مرضی کے بغیر مجھے پیدا کر کے کیوں منزلِ آزمائش میں ڈال دیا۔

میرا مالک مجھے جواب دے سکتا ہے کہ میں نے تجھے طاغوتِ منکر نہیں بلکہ بندۂ مسلم بنا کے پیدا کیا تھا تیری مرضی کے مطابق ۔ یہ اللہ اور بندے کے درمیان ہونے والا وہ معاہدہ ہے جو ہر لوحِ ضمیر اور ہر صحیفۂ وجدان پر لکھا ہوا ہے جس کے لئے نہ گواہ کی ضرورت ہے نہ شہادت کی۔

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِیْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّیَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ اَنْ تَقُوْلُوْا یَوْمَ الْقِیٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِیْنَ ۝ (۱۷۲۔ اعراف)

اور یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے فرزندانِ آدم کی پشتوں سے ان کی ذرّیت کو لیکر انھیں خود ان پر گواہ بنا کے پوچھا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے کہا ہم اسکے گواہ ہیں۔ ہم نے یہ عہد اسلئے لیا تاکہ تم قیامت میں یہ نہ کہو کہ ہم اس سے ناواقف تھے۔

•••

موت ــــــ اور ــــــ آخرت

جس طرح میری عقل ایک لمحہ کے لئے بھی یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ میرا یہ جسمانی نظام، میرا یہ وجود، میرا یہ سوچنے والا دماغ یہ گردش کرنے والی آنکھیں، یہ دھڑکنے والا دل۔ اندھے بے جان اور بے شعور سالمات کی حادثاتی تربیت کے ذریعے عالم وجود میں آگیا ہے۔

اسی طرح یہ بھی ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ کوئی حادثاتی انتشار اسے فنا اور معدوم کر دے گا۔

یعنی جس طرح سوچے، سمجھے، عادلانہ اور ریاضیاتی منصوبے کے تحت اسے عالم وجود میں لایا گیا ہے اسی طرح سوچے سمجھے عادلانہ منصوبے کے تحت اس کے ساتھ آخری برتاؤ بھی کیا جائے گا۔

میں جب بھی آخرت کے تصوّر کے بغیر اس زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے یہ زندگی مہمل، بے تکی، بے مقصد اور بے مفہوم نظر آتی ہے ــــــ اور شاید زندگی کے اسی ادھورے چہرے کو دیکھ کے شاعر نے کہا ہوگا

اک معمّہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو اک خواب ہے دیوانے کا

لیکن جب آخرت کے تصوّر سے جوڑ کے اس دنیا کو دیکھتا ہوں ــــ اس زندگی پر غور کرتا ہوں تو ہر گوشۂ حیات جگمگانے لگتا ہے۔ ہر ذرّہ بولنے لگتا ہے۔ ہر واقعہ اپنے مقصد کی گواہی دینے لگتا ہے، ہر قطرہ اپنے مفہوم کی شہادت دیتا ہوا نظر آنے لگتا ہے ــــ اور یہ زندگی کسی دیوانے کا خواب نہیں بلکہ حکمت و دانش کا عادلانہ منصوبہ نظر آنے لگتی ہے۔

کسی شعر کے پہلے مصرعہ کو دوسرے مصرعے سے الگ کر کے جب بھی سمجھنے کی کوشش کی جائیگی وہ دیوانے کا خواب ہی نظر آئے گا۔ اللہ نے ہر شے کا جوڑا بنایا ہے ــ زندگی کا بھی جوڑا ہے۔ ایک یہاں کی زندگی، ایک وہاں کی زندگی۔ ایک حیات فانی ایک حیات دائمی۔

میں جانتا ہوں کہ موت کے بعد جب روح بدن سے جدا ہو جاتی ہے تو یہ انسانی جسم سڑ گل کے بظاہر معدوم ہو جاتا ہے، اسے کیڑے کھا جاتے ہیں، آگ میں جلنے والے راکھ میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ پانی میں ڈوبنے والے دریائی جانوروں کی غذا بن جاتے ہیں، صحرا میں جان دینے والے درندوں کی شکم پری کا سامان کر دیتے ہیں، اور ان کا وجود نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور وہاں سے گذر کے بالآخر مشتِ خاک میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مگر میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ وہ عناصر کی پر پیچ وادیوں سے گذر کے اب کبھی واپس نہیں لوٹ سکتے۔

مئی جون کی تپتی ہوئی ننگی اور برہنہ خاک یا آتش زدگی کے بعد جلی ہوئی

سیاہ زمین کو دیکھ کے ہم یہی کہتے کہ اب یہاں زندگی کی روئیدگی ممکن نہیں۔ اگر برسات آتے ہی ننھّے ننھّے پودے اس زمین سے سر نکال کے ہمیں آواز نہ دیتے کہ ہم زندہ ہیں۔ حفاظت کرنے والا ہماری حفاظت کر رہا تھا۔ جبتک اسکی مرضی تھی ہم سوتے رہے۔ اس نے آواز دی تو آنکھ مل کے اٹھ گئے چند دن میں تناور درخت بن کے تمہارے سامنے کھڑے ہو جائیں گے۔

برسات بھر پانی میں ڈوبی ہوئی زمین کو دیکھ کے ہم یہی کہتے کہ جن پودوں کے بیج زندہ تھے وہ برسات میں نکل آئے ہیں اب یہاں کچھ باقی نہیں۔ جو کچھ ہے برسات کے طویل بارشوں میں بہتے ہوئے پانی کے تھپیڑوں میں سڑ گل کے فنا ہو جائیگا۔ اگر برسات کے ختم ہوتے ہی پودوں کی دوسری قسم ردائے خاک سے سر نکال کے ہمیں آواز نہ دیتی کہ ہمیں پورے سال سونے کا حکم دیا گیا ہم سوتے رہے۔ نہ گرمی کی تپش ہمارا کچھ بگاڑ سکی نہ برسات کی کیچڑ ہمیں فنا کر سکی، مالک نے پھر کھڑا کر دیا، ہم پھر تمہارے سامنے موجود ہیں۔

پودوں کی رجعت میری نگاہوں کے سامنے ہے۔ میں انسانوں کے واپس پلٹنے کا انکار کیسے کر دوں۔؟ صرف اس لئے کہ انسانوں کی واپسی کا موسم میں نہیں دیکھا ہے۔ میرا دیکھنا نہ دیکھنا کسی سچائی کو بدل نہیں سکتا۔ جبکہ میرا مالک اعلان کر رہا ہے کہ ـــــ ہم انھیں پودوں کی طرح انسان کو دوبارہ کھڑا کر دیں گے۔

★ اسی زمین سے پیدا کیا گیا ہے اسی میں جائیگا اور اسی میں سے پھر نکالا جائیگا۔ (طٰہٰ ۵۵)

★ ہم نے جس طرح پہلی پیدائش کا آغاز کیا اسی طرح اسے دہرائیں گے۔ یہ وعدہ ہے جسے ہم پورا کریں گے۔ (انبیاء ۱۰۴)

آج کے سائنسدانوں نے اپنے کامیاب تجربے کا اعلان کر دیا ہے کہ ہم کسی حیوان اور کسی جاندار کے جسم کے صرف ایک "خلیہ" (Cell) کو خاص حرارت اور مخصوص ماحول میں رکھ کے ہو بہو ویسے ہی دوسرا جاندار بنا کے کھڑا کر سکتے ہیں جو بالکل وہی ہوگا۔ نہ طبیعت میں فرق نہ شکل و صورت میں تفاوت ـــــ میری عقل راضی نہیں کہ میں مشاہداتی تجربات کو جھٹلا دوں ـــــ تو پھر میری عقل اس بات پر کیسے راضی ہو سکتی ہے۔ کہ جس سائنٹیفک نظام کا علم حاصل کر کے سائنسدانوں نے یہ کارنامہ انجام دیا ہے ـــ اس نظام کا خالق اور ان سائنسدانوں کو دماغ عطا کرنے والا مالک، انسان کو دوبارہ ویسا ہی جسم نہیں عطا کر سکتا؟ ـــ کیسے ممکن ہی کہ میں سائنسدانوں کے اعلان کو مان لوں اور ان کے پیدا کرنے والے کے وعدے کا انکار کر دوں۔

کائنات کے اتنے مضبوط ریاضیاتی نظام کی تعمیر کسی بے عقل حادثے نے نہیں بلکہ حکیمانہ منصوبے نے کی ہے ـــــ اس کا انجام بھی اسی حکیمانہ منصوبے کے تحت ہوگا حادثے کے ذریعہ نہیں۔

★ اس نے زمین و آسمان کو بے مقصد نہیں بلکہ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ (انعام)

★ عمل کے ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا۔ (زلزال ۱۰)

★ متقیوں کی جزا اور ٹھکانہ جنت ہے۔ (الفرقان ۱۵)

★ جنت بہترین جگہ ہے۔ (الفرقان ۲۴)

★ جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ (الفرقان ۷۹)
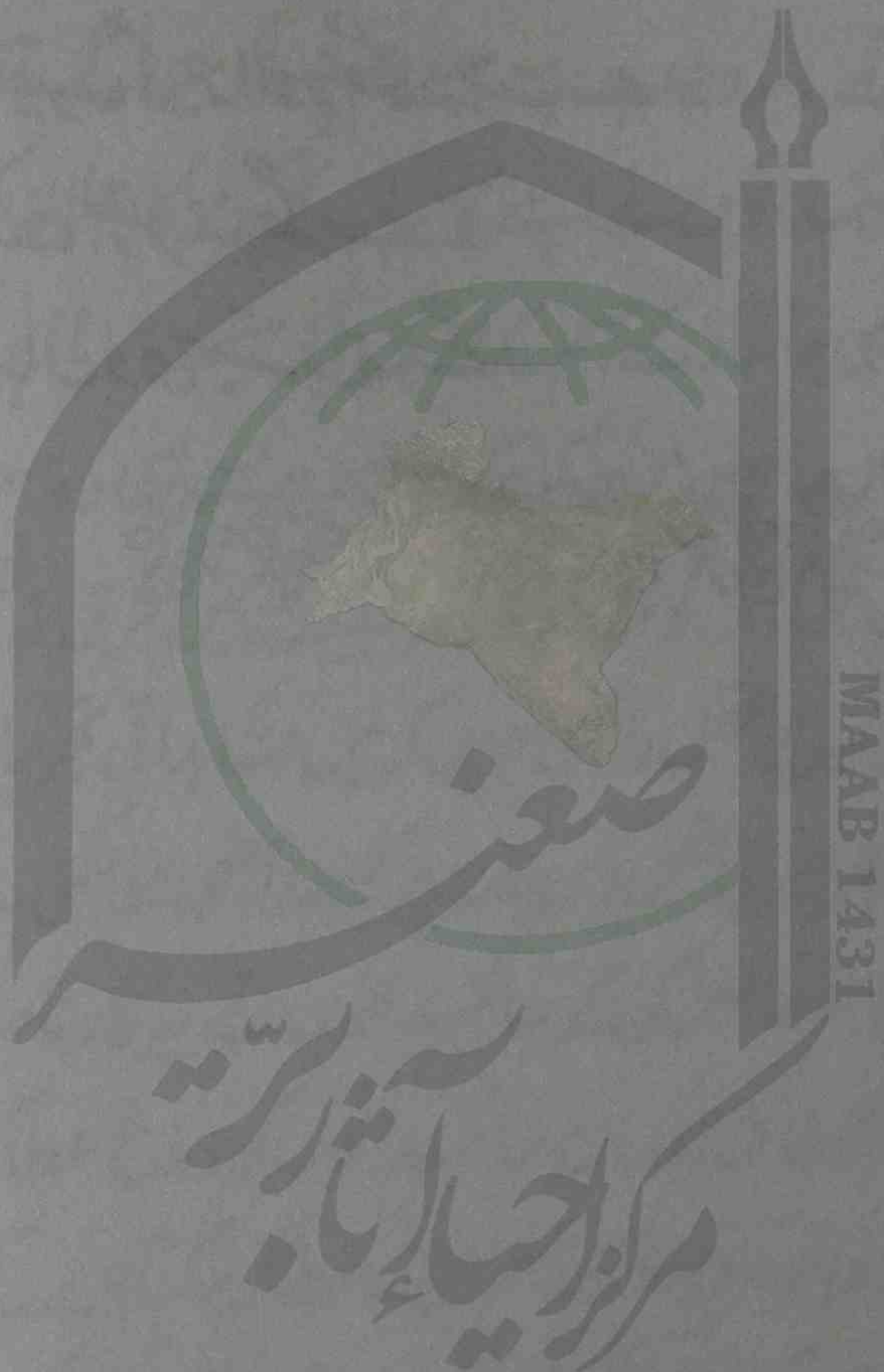
آلام و مصائب

میں سوچتا ہوں ــــ کہ جب وہ رحمٰن و رحیم، ہر وجود کو عالمِ وجود میں لا رہا ہے ــــ اس کی ہمہ گیر رحمت ہر شے کو گھیرے ہوئے ہے۔ اس کا لامتناہی کرم ہر چیز کو اپنی گرفت میں لئے ہے۔

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط

سب کچھ اسی کا ہے۔

★ ــــ اس کا اقتدار زمین و آسمان کو گھیرے ہوئے ہے۔ (آل عمران ۱۸۹)

★ ــــ وہ ہر شے کی نگرانی کر رہا ہے۔ (المائدہ ۱۱۷)

تو پھر یہ دنیا آلام و مصائب کی آماجگاہ کیوں بنی ہوئی ہے۔؟ انسان خوف و دہشت اور آفات و شدائد میں کیوں گھرا ہوا ہے۔؟ یہ اذیتیں کیوں جنم لے رہی ہیں؟ یہ ظلم و جور کا بازار کیوں گرم ہے۔؟ یہ قتل و غارتگری کا کھیل کیوں کھیلا جا رہا ہے۔؟

میں جانتا ہوں کہ ــــ آدمی کو مکلّف بنانے والی فطری تکلیفیں مصیبت نہیں رحمت ہیں۔ اگر پیاس کا احساس نہ ہو تو آبِ شیریں کا مزا کیا۔؟ اگر بھوک نہ لگتی تو لذّتِ کام و دہن، کے مواقع کہاں ملتے؟ اگر بیداری کا تناؤ نہ ہو تو میٹھی نیند کا لطف

کیسا؟ اگر کاروبار کی تھکن نہ ہو تو "ماحصل" کی قیمت کیا۔ ؟ زحمتیں نہ ہوں تو رحمتیں کیسی۔؟ اگر سکراتِ موت کا مرحلہ نہ آئے تو انسان حیاتِ دائمی کی محفل میں کیسے داخل ہو۔؟۔۔۔ ٹرین رکتی ہے تو مسافر کو جھٹکے لگتے ہی ہیں ۔۔۔ یہ نہ آلام ہیں نہ مصائب۔

لیکن ان آلام و مصائب کا وجود کیوں جنھوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔؟

- ۔۔۔ یہ زلزلے کیوں آتے ہیں جو لمحوں میں شاد و آباد گھروں کو قبرستان بنا دیتے ہیں۔؟
- ۔۔۔ یہ طوفان کیوں اٹھتے ہیں جو دیکھتے ہی دیکھتے نہ جانے کتنے سفینۂ حیات کو نگل جاتے ہیں۔؟
- ۔۔۔ یہ لنگڑے، لولے، اپاہج اور اندھوں کو کون پیدا کر رہا ہے۔؟
- ۔۔۔ یہ مہلک بیماریاں ہنستے مسکراتے گھروں کو غم کدہ کیوں بنا دیتی ہیں۔؟
- ۔۔۔ یہ حادثے لوگوں کو اچانک لقمۂ اجل کیوں بنا لیتے ہیں؟ جو بچ جاتے ہیں وہ معذوری کی زندگی گذارتے ہیں۔ کیا میرے رحمٰن و رحیم مالک کو ان مسافروں پر رحم نہیں آتا۔؟ کیا اولاد کے غم میں تڑپتے ہوئے باپ اور بلکتی ہوئی ماؤں پر اس کی نظر نہیں ہے۔؟
- ۔۔۔ آخر ایک بچہ بہت زیادہ ذہین اور دوسرا کند ذہن کیوں پیدا ہوتا ہے۔؟ یہ امیروں کے بچے کیوں دادِ عیش دے رہے ہیں اور غریبوں کے بچے کیوں فاقوں میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔؟

میں دیکھتا ہوں، غور کرتا ہوں اور فیصلہ کرتا ہوں کہ زمین پر پیدا ہونے والی تمام ہولناکیاں اور مصیبتیں دو حصوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔

• ـــ وہ آلام و مصائب جو تغیّراتِ طبعی اور فرزندانِ فطرت کے ہاتھوں عالمِ وجود میں آتے ہیں۔ جیسے ـــ زلزلے، طوفان، سیلاب، موسم کی تبدیلی درندوں کی درندگی، زہریلے جانوروں کی گزیدگی، بیماریوں کے جراثیم کا حملہ ناقص بچوں کی پیدائش وغیرہ۔

• ـــ وہ مصائب جو انسان خود اپنے لئے ایجاد کرتا ہے۔ مثلاً۔ قتل و غارتگری سیاسی و قومی جنگیں، نسلی و مذہبی فسادات، مہلک آتشیں، آہنی اور کیمیاوی اسلحوں کا استعمال، چوری، ڈاکہ، نشہ آور ایجادات، اغوا اور دہشت گردی وغیرہ۔

یا وہ مصیبتیں بھی جو انسان سماج کے رویوں کے ذریعے ایجاد کرتا ہے۔ مثلاً غربت، محرومی، استکبار، استضعاف، استعمار، استحصال، اور طبقاتی کشمکش کے ذریعے عالم وجود میں آنے والی ہزاروں مصیبتیں۔

یا ناعاقبت اندیشانہ مشینی نظام کے ذریعہ پیدا ہونے والے آلام۔ مثلاً طیاروں کا گرنا، جہازوں کا ڈوبنا، ٹرینوں کا ٹکرانا وغیرہ ـــ ان تمام آلام و مصائب کا موجد براہِ راست انسان ہے۔

زمین کا ہر خطّہ گواہ ہے کہ نظامِ فطرت و طبیعت کے ذریعے جس قدر آلام و مصائب عالمِ وجود میں آئے ان سے کئی لاکھ گنا زیادہ آلام و مصائب انسانی ہاتھوں کی کمائی ہیں۔ پوری صدی میں آنے والے زلزلوں نے اتنے

گھر نہیں اجاڑے جتنے گھروں کو ایک جنگِ عظیم کے کسی ایک دن میں اجاڑ دیا گیا۔

دنیا بھر کے سارے درندوں نے مل کے بھی اتنا خون نہ پیا ہوگا جتنا انسانی خون ایک متوکل، ایک چنگیز یا ایک ہٹلر کی لذّتِ نفس کے کام آگیا۔

دنیا بھر کے سارے زہریلے جانور مل کے بھی ایک زہریلے انسان کی مردم گزیدگی کا مقابلہ نہیں کر سکتے بقولِ غالب ؎

پانی سے سگ گزیدہ ڈرے جس طرح اسد
ڈرتا ہوں آئینے سے کہ مردم گزیدہ ہوں

آسمان سے ہونے والی تمام برق پاشیاں زمین پر ہونے والی کسی سیاسی لیڈر کی ایک زہریلی تقریر کا مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

دنیا بھر کے آتش فشانوں نے مل کے بھی اتنے انسانوں کو نہ جلایا ہوگا جتنے انسان کسی ایک جنگ یا ایک فساد میں پھونک دیئے جاتے ہیں یا صرف میرے ملک میں جہیز کے نام پر جتنی عورتیں جلائی جا چکی ہیں۔

ناقص خلقت کے ذریعے لاکھوں بچوں میں دو ایک ذہنی طور پر معذور پیدا ہوتے ہیں مگر شاطرانِ مذہب و سیاست ذاتی مفاد کے لئے پوری پوری قوم اور پوری پوری نسل کو دیوانہ بنا دیتے ہیں۔

جسمانی نقص لیکے لاکھوں میں دو چار بچے پیدا ہوتے ہیں۔ مگر انسانوں

کی وحشیانہ ہوس پرستی لاکھوں صحت مند بچوں کو معذور بنا دیتی ہے۔
کسی انسان کا دل ٹٹول کے دیکھئے، وہ درندوں کے خوف سے نہیں انسانوں کے خوف سے بھرا ہوگا۔ جنگلوں میں سفر کرنے والا مسافر اتنا سہما ہوا نہ نظر آئے گا جتنا بھری بستیوں سے گذرنے والا مسافر خوف زدہ ہوگا۔

اس کے علاوہ وہ آلام و مصائب بھی جو بظاہر طبعی تغیرات کے ذریعہ عالم وجود میں آتے ہیں، ان کا ذمہ دار بھی بالواسطہ انسان ہی ہے۔
اس لئے کہ اللہ نے انسان کو اپنی خلافت کا منصب عطا کر کے اس کارگاہِ حیات کی سیادت سونپ دی ہے۔ اسے عقل، ارادہ اور اختیار کا مالک بنا کے کائنات کو اس کیلئے مسخّر کر دیا ہے۔
اب یہ انسان کی ذمہ داری ہے کہ طبعی تغیّرات سے فائدہ اٹھائے، اشیائے عالم کو کام میں لائے ان کے منفی اثرات اور نقصان دِہ ردِّ عمل سے خود کو بچاتا ہوا حاکمانہ تصرّف کرے۔
سیلابوں سے اپنی زمینوں کو زرخیز بنائے۔ بہتے ہوئے پانی میں خود بہنے کے بجائے اس سے بجلی کی طاقت حاصل کر کے اپنے گھروں کو روشن کرے۔ طوفانوں میں اپنے گھروں کے انہدام کے بجائے اس کے توڑے ہوئے پتھروں سے اپنا گھر بنائے۔ زہر کھا کے مرنے کے بجائے اسے تریاق بنائے۔ آتش فشاں میں خود جلنے کے بجائے اس کے اگلے ہوئے معدنیات

سے فائدہ اٹھائے۔

یہی منصوبۂ الٰہی ہے اور یہی مرضیٔ پروردگار۔

انسان حسبِ عقل کی روشنی میں تجربات و مشاہدات کے ذریعے کائنات کو فتح کرتا جا رہا ہے۔ اَن دیکھی توانائیوں کو اپنے قبضے میں کر چکا ہے۔ ہواؤں کے دوش پر سفر کر رہا ہے۔ جس کا جھنڈا چاند پر لہرا ہے اور اس کے بنائے ہوئے سیارچے مریخ و مشتری کی خبر دے رہے ہیں۔ جس کے لئے قرآن پوری وضاحت سے اعلان کر چکا ہے۔

☆۔ زمین پر سب کچھ انسانوں کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ (البقرہ ۲۹)

☆۔ اسے زمین میں اختیار دے دیا۔ (الاعراف ۱۰)

☆۔ جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ آسمان میں ہے سب کو انسان کا تابعدار بنا دیا۔ (لقمٰن ۳۱)

مجھے یقین ہے کہ انسان اگر اپنی وہ توانائیاں، وہ صلاحیتیں اور طاقتیں جو فوجی طاقت، اسلحہ سازی اور ایک دوسرے کی بستیوں کو تباہ کرنے کیلئے خرچ کر رہا ہے، اس کا عشرِ عشیر بھی اگر انسانیّت کی خدمت میں لگا دیتا تو نہ زلزلے گھروں کو گرا سکتے تھے نہ طوفان لوگوں کو بہا سکتے تھے، نہ آلودگی سے فضائیں زہریلی ہوتیں نہ مہلک بیماریاں جنم لیتیں نہ امراض لاعلاج رہتے۔ نہ ظن و گمان کی پیروی سے حادثے رونما ہوتے نہ فکر و عمل کا بگاڑ جینیاتی (Genetic) نظام میں خلل پیدا کر کے ناقص بچے پیدا ہونے کا سبب بنتا۔

اگر انسان عقلِ سلیم سے کام لیتا اور انبیاء علیہم السّلام کے ذریعے ملنے والی اللہ کی ہدایتوں پر عمل کرتا تو یہ آلام و مصائب سے بھری ہوئی دنیا جنت کا نمونہ ہوتی۔

☆۔ اگر بستیوں کے لوگ ایمان لاتے اور رضائے الٰہی کی پابندی کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔ (الاعراف ۹۷)

اس کا سیدھا مطلب یہی ہے کہ زمین پر پیدا ہونے والے تمام آلام و مصائب کا ذمہ دار تنہا انسان ہے ـــــ میرا مالک رحمٰن و رحیم اور ہر طرح کی برائی اور ظلم سے پاک ہے ـــــ وہ صرف خالقِ خیر ہے، زمین پر جتنا شر ہے سب انسانوں کا پیدا کیا ہوا ہے۔

☆۔ تَبَارَکَ اللّٰہُ اَحْسَنُ الْخَالِقِیْنَ ۔ القرآن

اللہ خیر و برکت کے ساتھ بہترین پیدا کرنے والا ہے۔

☆۔ اَلَّذِیْ اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَہٗ ۔ القرآن

اس نے جو کچھ پیدا کیا ہے بہترین پیدا کیا ہے۔

☆۔ اللہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا بلکہ انسان خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتا ہے۔ (یونس ۴۴)

☆۔ یقیناً اللہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ لوگ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے ہیں۔ (روم ۹)

☆۔ خدا کسی پر ظلم کرنے والا نہیں ہے لوگ خود اپنے نفس پر ظلم کرتے ہیں۔ (توبہ ۷۰)

امتحان و آزمائش

یقیناً یہ دنیا آزمائش گاہ ہے ــــ

مگر امتحان و آزمائش کا قطعاً یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ اپنے بندوں کو مصیبت میں مبتلا کرکے یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ یہ بندے کس طرح تڑپتے ہیں؟ اور کس رفتار سے روتے ہیں۔؟ اور آنسوؤں کو روکنے کی کس میں کتنی صلاحیت ہے؟

یہ دنیا ــــ زمانۂ قدیم کے جاگیرداروں کی تفریح گاہ نہیں ہے۔ جہاں غلاموں کو لڑا کے زخم لگانے اور زخم کھانے کا امتحان لیا جاتا تھا، کوڑے لگا کے قوت برداشت ناپی جاتی تھی۔ بے گناہوں کے گلے پر خنجر کی دھار آزمائی جاتی تھی ــــ اور سب سے تیز دوڑنے والے اور سب سے زیادہ قلابازیاں کھانے والے انعام پاتے تھے اور تھک کے بیٹھ جانے والوں کی گردن مار دی جاتی تھی۔

بلکہ یہ دنیا عدل و انصاف کی بنیاد پر، عقل و منطق کے ہاتھوں قائم ہونیوالی کارگاہِ علم و عمل ہے۔ جہاں انسان کی ایک ایک سانس کا حساب ہو رہا ہے۔ اور عدل و رحمت کی نگاہیں ذرّے ذرّے کی نگرانی کر رہی ہیں۔ قرآن اس نظام کے لئے قَآئِمًا بِالْقِسْطِ کا اعلان کر رہا ہے۔

☆۔ ہم نے زمین آسمان اور جو کچھ اس میں ہے تفریحاً نہیں پیدا کیا۔ (الانبیاء ۱۶)

★ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ ۔ (احقاف ۳)

ہم نے نہیں پیدا کیا آسمان اور زمین کو مگر حق پر۔

میں جب بھی قرآن کی روشنی میں غور کرتا ہوں تو اس امتحان گاہِ عالم کا پورا نظام سمجھ میں آجاتا ہے۔

اگر بہت سے "خطِ مستقیم" یعنی بالکل سیدھی لکیریں کاغذ پر کھینچی جا رہی ہوں اور سب کا رخ ایک ہی مرکزی نقطے کی طرف ہو، تو خواہ ان لکیروں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو، ممکن نہیں کہ ایک لکیر دوسری لکیر سے ٹکرا جائے۔ لیکن اگر کوئی لکیر بال برابر بھی ٹیڑھی ہو گئی تو ممکن نہیں کہ آگے بڑھ کے کسی دوسری لکیر سے نہ ٹکرائے۔

یعنی اگر ایک لکیر اپنی جگہ سے ہٹی تو لکیروں میں تصادم یقینی ہے۔ ایک ٹیڑھی لکیر دوسری لکیر کو ٹیڑھی کرے گی دوسری تیسری کو ـــــ یہاں تک کہ لکیروں کا پورا نظام درہم برہم ہو جائیگا۔

ٹھیک یہی حال انسانی معاشرے کا ہے۔

ہر بچہ اسلامی فطرت پر پیدا ہوتا ہے ـــــ اور اس کی فطرت کا رُخ بالکل صراطِ مستقیم پر ہوتا ہے۔ اچھائیوں سے اسے محبت ہوتی ہے اور برائیوں سے اسے نفرت ہوتی ہے ـــــ وہ پیدائشی طور پر نہ چور بننا چاہتا ہے نہ ڈاکو، نہ کسی کو فریب دینا چاہتا ہے نہ دھوکا ـــــ اندر سے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ صاف ستھری اور سچی زندگی گذارے، کسی کا راستہ روکنے کے بجائے دوسروں

کو سہارا دے۔

مگر آگے بڑھ کے منحرف عناصر اس پر دباؤ ڈالتے ہیں۔ گرد و پیش کے بگڑے ہوئے حالات اس پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ خارج سے لگنے والے جھٹکے اس کے داخلی جذبات کو حدِّ اعتدال سے ہٹا دیتے ہیں ــــ پھر وہ سیدھا راستہ چھوڑ کے "شارٹ کٹ" کے ذریعہ زندگی کی دوڑ میں لوگوں کے برابر پہونچنا چاہتا ہے۔ صراطِ مستقیم سے ہٹنے کے بعد شیاطین اس پر قبضہ کر لیتے ہیں اور وہ دوسروں کے بھی صراطِ مستقیم سے ہٹنے کا سبب بن جاتا ہے۔ ایک کا ظلم دوسرے کو ظالم بنا دیتا ہے۔ چوروں سے انتقام کا جذبہ چوری کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ اپنی توہین کا بدلہ دوسروں کی توہین کر کے لیتا ہے۔ رشوت خور ساتھی اسے بھی رشوت خور بنا دیتے ہیں۔ اقتصادی ناہمواری غلط احساسِ غیرت پیدا کر کے چوری، ڈاکہ، جوا، فریب، جھوٹ اور غصب کے راستے پر ڈال دیتی ہے ــــ مایوسی، توہمات میں مبتلا کر کے شرک اور بت پرستی کے اندھیروں میں پہونچا دیتی ہے۔ نام نہاد علماء و روحانیین کا طریقۂ حیات بھی جادۂ حق پر اسے سہارا دینے کے بجائے اس کی حوصلہ شکنی کرتا ہے۔

بس یہی ہے انسان کا امتحان ــــ اور انسانیت کی آزمائش کہ منحرف عناصر کے درمیان خود کو راہِ مستقیم پر باقی رکھے، اندھے جذبات کی انگلی تھام کے چلنے کے بجائے علم اور عقل کی روشنی میں اپنا سفر طے کرے۔ دنیا کو اپنا مقصود بنانے کے بجائے رضائے پروردگار کو پیشِ نظر رکھے۔

اولاد کی محبّت، خاندانی عصبیّت، نسلی برتری کا جذبہ، دولت کی فراوانی، فقر کی زیادتی الغرض غیر عادلانہ معاشرے کے شیاطین ہر وقت انسان کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دینے کے درپے ہیں۔ وہ انسان کے عمل کو بھی سیدھے راستے سے ہٹا دینا چاہتے ہیں اور فکر کو بھی۔ اس طرح سب ایک دوسرے کا امتحان بن گئے ہیں۔

وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ لِبَعْضٍ فِتْنَةً ؕ (فرقان ۲۰)

ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کی آزمائش کا ذریعہ بنایا ہے۔

اسی لئے اس کے بندے کم از کم اپنی نمازوں میں دس بار دعا کرتے ہیں کہ پالنے والے "صراطِ مستقیم کی ہدایت کر"۔

کچھ لوگ سیدھے راستے سے ہٹتے ہیں تو ہٹتے چلے جاتے ہیں نہ خوفِ خدا باقی رہتا ہے نہ خیالِ آخرت۔ اور صراطِ مستقیم سے اس قدر دور ہو جاتے ہیں کہ واپس پلٹنے کا امکان ہی ختم ہو جاتا ہے ــــ قرآن ان کی ناکامی کا واضح اعلان کر دیتا ہے۔

٭۔ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ وَعَلٰى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ (بقرۃ ۷)

اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور آنکھوں پر پردے پڑ گئے ہیں، ان کے لئے بہت بڑا عذاب ہے۔

البتہ کچھ لوگ حالات کے دباؤ میں صراطِ مستقیم سے ہٹتے ہیں مگر کچھ دور چل کے واپس پلٹ آتے ہیں، اپنی غلطیوں اور گناہوں پر نادم ہو کے توبہ کرتے ہیں، اپنا

رخ پھر اللہ کی طرف کر لیتے ہیں۔ مغفرت کی دعا مانگتے ہیں۔ اُدھر سے جواب ملتا ہے :۔

★۔ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِہِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ؕ اِنَّہٗ ھُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ ○

(الزمر ۵۳)

اے میرے بندو! جنھوں نے اپنے نفسوں پر ظلم کیا ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جانا۔ اللہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والا بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔

یہ بھی امتحان میں بڑی کامیابی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے اعلان ہے:

لَھُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِہَا الْاَنْھٰرُ ؕ ذٰلِکَ الْفَوْزُ الْکَبِیْرُ ؕ (الصف ۱۲)

انکے لئے باغات ہیں جنکے نیچے نہریں جاری ہیں یہ بڑی کامیابی۔ ہے۔

مگر اللہ کے کچھ ایسے بندے بھی ہوتے ہیں جنھیں بال برابر صراطِ مستقیم سے ہٹایا نہیں جاسکتا۔ دنیا کی تمام گمراہ طاقتیں اپنی ساری طاقتیں خرچ کر کے بھی انکے پائے ثبات میں جنبش بھی نہیں پیدا کر سکتیں۔ سر کٹ جاتا ہے۔ گھر لٹ جاتا ہے۔ گود کے پالے کام آجاتے ہیں۔ ظلم کے سیلاب ٹکرا کے واپس پلٹ جاتے ہیں مگر صبر کی پیشانی پر پسینہ بھی نہیں آتا۔

ان کے نقوشِ قدم صراطِ مستقیم کی نشاندہی اور بھٹک جانے والوں کی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ پاک و پاکیزہ لوگ جب امتحان سے فارغ ہوتے ہیں تو قدرت آواز دیتی ہے :

٭ یٰاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً ○ (الفجر ۲۷۔۳۰)

اے نفسِ مطمئن! اپنے رب کی طرف پلٹ آ، وہ تجھ سے راضی ہے تو اس سے راضی۔ ...

قطعہ

تربیت ہے کہ آزمائش ہے
راحتیں کیوں ہیں درد و غم کیوں ہے
کوئی منزل اگر نہیں موجود
پھر یہ راہوں میں پیچ و خم کیوں ہے
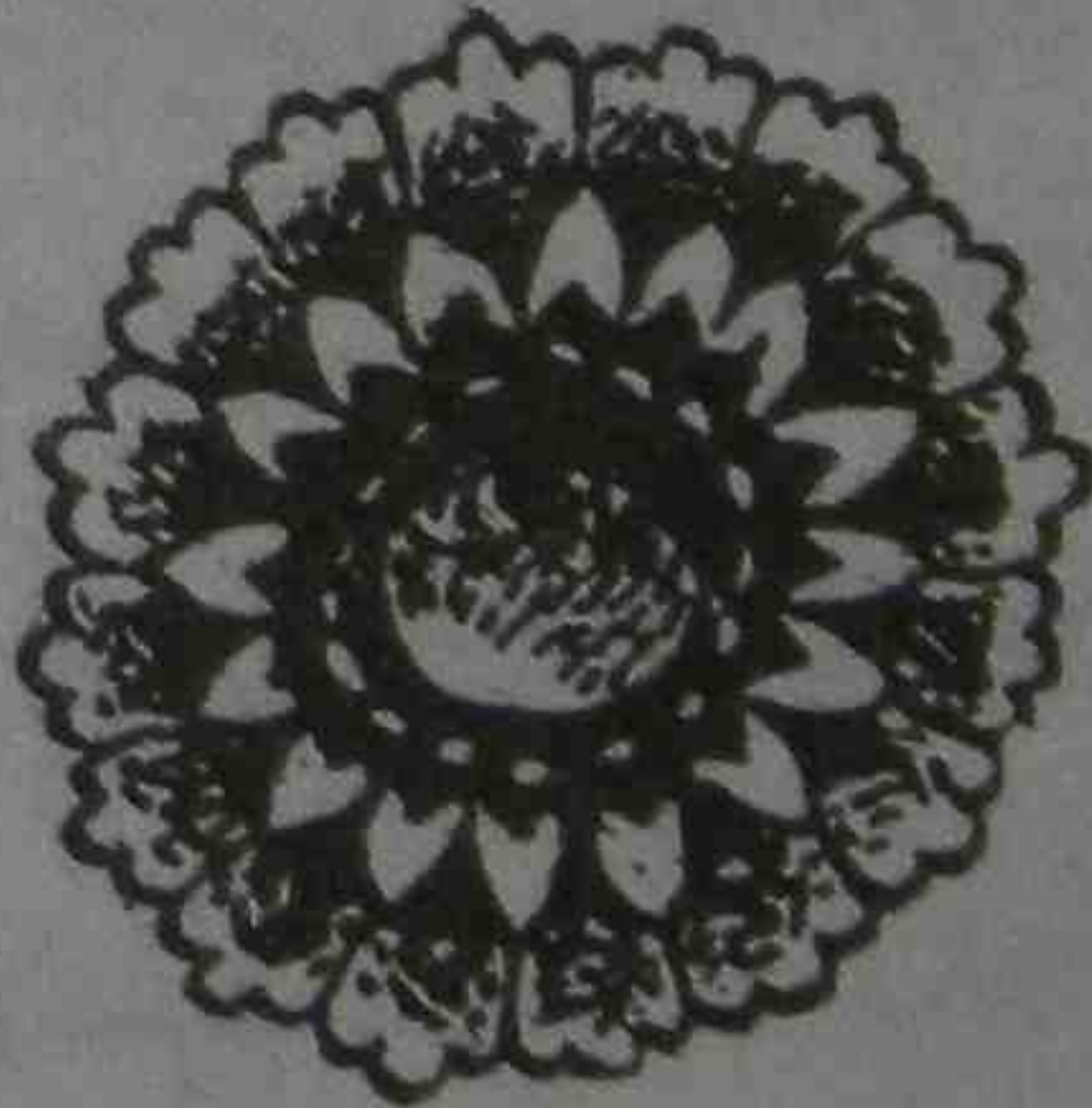
رحمٰن و رحیم

وہ رحمٰن و رحیم ہے تو اپنے بندوں کو آلام و مصائب سے بچاتا کیوں نہیں؟

عقل کہتی ہے کہ انسان کو جبر اظلم و جور سے روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے کہ اس سے ہر طرح کا اختیار سلب کر لیا جائے۔ مگر اختیار کے بغیر "ارادہ" بے مفہوم ہے اور اختیار و ارادے کے بغیر عقل کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہ جاتی یعنی عقل کا لازمہ ہے اختیار، اور اختیار کا لازمہ ہے ارادہ۔

۔ اگر انسان سے عقل، ارادہ، اور اختیار سلب کر لیا جائے گا تو پھر انسان کی گوشت کے لوتھڑے سے زیادہ کوئی حیثیت نہ رہے گی ـــــــ اور گوشت کے ایک بے شعور ٹکڑے کے لئے اتنی بڑی محفلِ حیات سجانا خلافِ عقل بھی ہے اور خلافِ عدل بھی۔

اللہ نے انسان کو عقل عطا کی اور اُسے محدود اختیار کا مالک بنایا تاکہ وہ اپنے ارادے سے اپنے اختیاری میدانِ عمل میں اپنی عقل کا استعمال کر سکے اور انبیاء کرام کے ذریعہ ملی ہوئی آسمانی ہدایت کی روشنی میں زندگی کے مرحلے سر کرتا جائے۔ یہی اس اشرف المخلوق کا امتحان ہے اور یہی زندگی کا سیدھا راستہ ہے۔

وَّاَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ ؕ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ۝ (یٰسٓ ۶۱)

اس سیدھے راستے سے انحراف، مالک کی نافرمانی اور کائنات کے عادلانہ نظام کی حکیمانہ رفتار سے ٹکراؤ ہے اور ٹکراؤ کے نتیجے میں آلام و مصائب کا بھاری بوجھ۔

اس کے باوجود کہ اللہ نے انسانوں کو ارادہ و عمل کی آزادی دے رکھی ہے۔ مگر وہ انسانوں کو اختیار دے کے خود بے اختیار نہیں ہو گیا ہے۔ انسانوں کے ہاتھوں پیدا ہونے والے آلام و مصائب بھی اس کی رحمت اور اس کے کرم کے گواہ ہیں۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر اپنی رحمت کے دروازے بند نہیں کرتا۔

اگر وہ انسانوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیتا تو میرے جیسے کمزور و ناتواں بندے آلام و مصائب سے بھری ہوئی اس زمین پر ایک سانس بھی نہ لے سکتے۔ خود اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے شکنجے میں جب انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ فریاد کرتا ہے تو وہی رحمٰن و رحیم اس کی توبہ قبول کرتا ہے اور اسے نجات دیتا ہے۔

اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاہُ وَیَکْشِفُ السُّوْٓءَ (نمل ۶۳)

کون ہے جو بے قراروں کی فریاد سنتا ہے جب اُسے پکارتے ہیں، اور مصیبتوں کو رفع کر دیتا ہے۔

خود اُس نے کہا ہے:-

- مجھے پکارو! میں دعائیں قبول کرتا ہوں (مومنون ۶۱)
- پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے تو میں اس کی فریاد سنتا ہوں اور اُسے

جواب دیتا ہوں۔ (بقرہ ۱۸۶)

——— تاریخ انسانی میں بارہا ایسا ہوا ہے کہ خود انسان نے انسانیت کو ہلاکت کے دہانے پر پہونچا دیا تھا مگر اس کی رحمت کے نہ دکھائی دینے والے ہاتھوں نے ہینڈل گھما کے تاریخ کا رُخ دوسری طرف موڑ دیا۔ جن کا وجدان کچلا یا ہوا نہیں ہے وہ رحمت کے نادیدنی ہاتھوں کو پہچانتے ہیں۔

——— جاگیردارانہ نظام جب بہت دن انسانوں کا خون پی چکا، قریب تھا کہ غلامی کی بندشوں میں جکڑی ہوئی انسانیت کا دَم نکل جائے کہ اسی ظالمانہ سماج کی کوکھ سے سرمایہ داری نے اپنا سر نکالا اور غلامی کی زنجیریں کاٹ کے غلاموں کو مزدور بنا دیا۔ غلام، آقا کی مرضی کے بغیر سانس بھی نہیں لے سکتے تھے مگر مزدور اپنی مرضی سے سرمایہ دار کی مرضی کے پابند ہو گئے، جاگیرداری قتل کر کے "رقصِ بسمل" کا تماشہ دیکھتی تھی مگر سرمایہ داری بغیر قتل کئے لوگوں کو دولت کی ڈگڈگی پر نچانے لگی ——— جاگیردارانہ نظام نے فرعون و نمرود کو خدا بنایا تھا سرمایہ داری نے بے جان تجوریوں کو خدا بنا دیا۔

پھر ضرورت کے اندھے سیلاب اور تقسیم کے شیطانی نظام نے اشتراکیت کو پیدا کر دیا، پھر اشتراکیت نے سرمایہ کے مقابلہ میں محنت کا نیا ابوالہول تعمیر کر دیا۔ اور انسانیت کو سانس لینے کا موقع ملتا گیا۔

جس نے زہر ہی کو زہر کا تریاق بنایا ہے، وہ خدائے رحیم ایک مصیبت سے دوسری مصیبت کا علاج کر دیتا ہے۔

وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ
(البقرہ ۲۵۱)

اور اگر اسی طرح بعض کو بعض سے دفع نہ کرتا تو ساری زمین میں فساد پھیل جاتا لیکن اللہ انسانوں پر بڑا فضل کرنے والا ہے۔

ہر غور و فکر کرنے والے انسان کے انفرادی تجربات گواہی دیں گے کہ بارہا ایسا ہوا ہے کہ کسی ان دیکھی طاقت نے اُسے بھیانک تباہی کے غار میں گرنے سے بچالیا ہے اور کسی چھوٹی مصیبت کو کسی بڑی مُصیبت کا کفّارہ بنا دیا ہے۔

کبھی وہ ایک ظالم کے ذریعہ دوسرے ظالم کو روک دیتا ہے۔ کبھی وہ ایک قاتل کے پیچھے دوسرے قاتل کو لگا دیتا ہے تاکہ اس کے دوسرے بندے محفوظ رہیں۔

—— کبھی انہیں آلام و مصائب کو جو خود انسان کے پیدا کئے ہوئے ہیں ان کے نفوس کے تزکیہ کا ذریعہ بنا دیتا ہے۔ دماغ پر چھایا ہوا خود فریبی کا "کاربن" شدائد کے دامن سے صاف کر دیتا ہے کہ انسان کو حقائق کا چہرہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ اور اچانک انہیں مصیبتوں کے ذریعہ وہ انسانی زندگی کا رُخ سیّئات کی طرف سے حسَنات کی طرف موڑ دیتا ہے۔

جس کو چاہتا ہے پاکیزہ بنا دیتا ہے مگر اپنے بندوں پر دھاگے کے برابر ظلم نہیں کرتا۔

(نساء ۴۹)

—— اور کبھی کبھی یہ مصیبتیں تنبیہ کا کام کرتی ہیں۔

کسی گاؤں میں سَو بچّے اندھیرے میں کھیل رہے تھے کہ ناگہاں ایک بچّے کے

پاؤں کے نیچے آ کے ایک بچھو نے اُسے ڈنک مار دیا ـــــ اب وہ بچھو کاٹا ہوا بچہ تڑپ رہا ہے، چیخ رہا ہے۔ اس کی تکلیف دیکھ کے، دیکھنے والے بھی تڑپ جاتے ہیں کوئی یوں بھی سوچ سکتا ہے کہ اس معصوم بچے پر اس رحمٰن و رحیم کو رحم نہیں آیا اور اتنی اذیت میں مبتلا کر دیا۔ اسے بچہ کو بچھو سے بچانا چاہئے تھا۔

مگر سوچنے کا صحیح زاویہ یہ ہے کہ ـــ رات کے دامن میں حشرات الارض اپنی غذا تلاش کرتے ہیں۔ والدین یا تربیت کاروں کی ذمہ داری تھی کہ بچوں کو اندھیرے میں ننگے پاؤں نہ نکلنے دیں اس نے جہالت اور گمان کے اندھیروں میں عمل کی ممانعت کر دی ہے۔ اور یہ اس کی رحمت نہیں تو اور کیا ہے؟ کہ اس نے ۹۹ بچوں کو بچھو سے بچا بھی لیا یعنی ۹۹ بچے اس کی رحمت کی گواہی دے رہے ہیں۔ کم از کم ایک بچے کو اس کے عدل کا گواہ بھی ہونا ہی چاہیئے ـــ جو دوسرے بچوں کی ہدایت کا ذریعہ بن جائے۔ پھر یہ مجرد عدل کہاں؟ پس منظر میں رحمت اپنا کام کر رہی ہے۔ اب یہ بچہ اندھیرے میں قدم رکھتے ہوئے ڈرے گا۔ ظن و گمان کی بنیاد پر فیصلہ نہ کرے گا۔ جہل کے اندھیروں کے بجائے علم کی روشنی سے محبت کرے گا۔ ایک رات کی تکلیف طویل اذیتوں سے بچا لے گی۔

لاکھوں بار ایسا ہوا ہے کہ مصائب کے جھٹکوں نے انسان کو بے عملی کے بستر سے اٹھا کے میدان عمل میں پہونچا کے کامیابی کے راستے پر کھڑا کر دیا ہے ؎

گرا گرا کے سنبھلنا سکھایا جاتا ہے
خود اپنے پاؤں پہ چلنا سکھایا جاتا ہے

مگر.....

• هُدًى وَّذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ۔ (غافر ۵۴)

عقل والے ہی نصیحت قبول کرتے ہیں۔

— اکثر اللہ کے نیک بندے بظاہر پریشانیوں میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں. اور بدکردار لوگ بظاہر عیش و عشرت کی زندگی گذارتے نظر آتے ہیں — میرے پاس وہ علم نہیں کہ کسی کی پریشانیوں کا قطعی سبب معلوم کرلوں اور میرے پاس وہ نظر نہیں جو عیش و عشرت کے پیچھے چھپی ہوئی بھیانک تباہی کا چہرہ دیکھ لے۔

مگر مجھے چند سال پہلے ایک نامور اہلِ قلم کا سُنایا ہوا واقعہ ضرور یاد ہے۔ جب وہ اسکول میں داخل ہوئے تو اُن کے استاد جو ایک بہترین معلّم تھے ان کی چھوٹی سے چھوٹی غلطی کو بھی نظر انداز کرنے پر تیّار نہیں تھے جبکہ ان کے کلاس کے دوسرے لڑکوں کی بڑی سے بڑی غلطی کو معاف کر دیتے تھے. ایک لائق اور محنتی طالب علم ہونے کے باوجود ان کی معمولی غلطیوں پر استاد جب ان کو ڈانٹتے اور ان کی سرزنش کرتے تو وہ سمجھتے تھے کہ یہ میرے ساتھ زیادتی اور بے انصافی ہے — مگر جب انہوں نے ہائی اسکول کے امتحان میں غیر معمولی نمبروں سے ممتاز کامیابی حاصل کی اور استاذ مذکور ان سے ملنے آئے تحسین و تعریف کا اظہار کیا تو شاگرد نے شکایت کی کہ مگر آپ تو ہمیشہ اپنے دوسرے شاگردوں کے مقابلے مجھ پر سختی کرتے تھے! — استاد نے شاگرد کو لپٹا کے کہا بیٹے! یہ غیر معمولی کامیابی میری انہیں تنبیہوں کا نتیجہ ہے۔ دوسرے شاگردوں کی گرفت اس لئے نہیں کرتا تھا کہ وہ نالائق تھے اور میں جانتا تھا کہ ان پر میری تنبیہوں کا اثر ہونے والا نہیں. اور اگر ہوگا بھی تو الٹا اثر ہوگا — میں نہیں چاہتا تھا کہ تم بھی ویسے

ہی ہو جاؤ ۔ بلکہ میری خواہش تھی کہ تم چھوٹی غلطی سے بھی بچو جو بڑی غلطی کا پیش خیمہ بنتی ہیں ۔ یہ ایک ہونہار شاگرد سے استاد کی محبت تھی نہ کہ بے انصافی۔

اور ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا کی کسی بڑی مصیبت کو آخرت کی دائمی ہلاکت سے بچانے کا ذریعہ بنا دے۔

حضرت خضرؑ اور حضرت موسیٰؑ کا واقعہ قرآن نے بیان کیا ہے۔ حضرت خضرؑ نے ایک بے گناہ لڑکے کو قتل کر دیا انہیں یقینی علم حاصل تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر اتنا بڑا ظالم بن جائے گا کہ اپنے والدین ہی کو قتل کر دے گا ۔ یہ "سزا" نہیں تھی کہ کہا جائے، جرم سے پہلے سزا کیسی۔؟ بلکہ یہ نظامِ مشیت، کی ایک مثال تھی، جسے اللہ نے حضرت خضرؑ کے ذریعہ حضرت موسیٰؑ کے سامنے پیش کر دی ۔ یعنی اس طرح قتل ہو کے وہ لڑکا دائمی ہلاکت اور جہنم کی آگ سے بچ گیا، اور اس کے شر سے مومنین اور اس کے والدین بھی محفوظ کر لئے گئے اور سماج کو ایک وحشیانہ کردار سے بچا لیا گیا[1]

موت فی نفسہ مرنے والے کے لئے کوئی مصیبت نہیں کسی کی موت خود اس کا امتحان نہیں بلکہ امتحان کی تکمیل ہے زندہ رہ جانے والوں کا امتحان ہے۔ اگر کامیابی کے ساتھ امتحان گاہ سے قبل از وقت چھٹکارا مل جائے تو کون اسے ناپسند کرے گا ۔ یہ چند روزہ زندگی

---

[1] یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ مستقبل کے علم کی بنیاد پر ایسے اقدام کا حق اللہ نے حضرت خضرؑ کے علاوہ کسی نبیؐ کو بھی نہیں دیا۔ نام نہاد خواب یا کشف کی بنیاد پر کوئی ایسا فیصلہ کرنا حرام ہے غیب کا علم صرف اللہ کو ہے۔

ہی اصل زندگی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کی نگاہِ بصیرت پردے کے پیچھے دیکھنے کی صلاحیت رکھتی تھی وہ پستانِ مادر سے زیادہ موت سے مانوس تھے اور موت کو گلے لگانے کے لئے ایک دوسرے پر سبقت کرتے تھے۔ آنے والی موت کی خبر پورے وجود میں مسرّت کی لہر دوڑا دیتی تھی۔ بیٹوں کی موت پر باپ شکر کا سجدہ کرتے تھے اور مائیں ایک دوسرے کو مبارک باد دیتی تھیں۔

میرے پاس وہ آنکھیں نہیں جو لوگوں کی زندگی کے تہہ خانوں میں اتر کے حقائق کا جائزہ لے سکے، نہ میرے پاس وہ علم ہے جو لوگوں کے ماضی و مستقبل کا پردہ اٹھا کے آلام و مصائب کی صحیح علّت معلوم کرلے ۔ مگر مجھے یقین ہے کہ اللہ اپنے بندوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا۔

• اللہ اپنے بندوں پر ذرّہ برابر ظلم نہیں کرتا، نیکیوں کو دوگنا کر دیتا ہے اور اپنے پاس سے (مزید) اجرِ عظیم عطا کرتا ہے۔ (سورہ نساء ۴۰)

میں مانتا ہوں کہ انسانی سماج بے انصافیوں سے بھرا ہوا ہے مگر مجھے یقین ہے کہ اُن بے انصافیوں کی رگوں میں قدرت کا انصاف چھُپا ہوا ہے۔

نہ کوئی اس کے عدل کی گرفت سے باہر ہے نہ کوئی اس کی رحمت سے محروم ہے۔

وہ دیکھئے ! ایک ارب پتی اپنے عیش کدے میں بے چین اور مضطرب ٹہل رہا ہے آدھی رات گذر چکی ہے اُسے نیند نہیں آرہی ہے اس مہینے میں اسے کروڑوں کے بجائے صرف لاکھوں میں نفع ہوا ہے ڈپریشن نے ایک میٹھی نیند سے بھی محروم کر دیا ہے۔ دولت کی فراوانی نے غذاؤں کو بے لذّت بنا دیا ہے۔ ضرورتوں کے فقدان نے خاندانی زندگی

کے تانے بانے توڑ دیئے ہیں ـــــــ بیوی کلب میں ہے اور لڑکے شراب خانے میں۔

دوسری طرف ـــــــ ایک مزدور پورے دن مزدوری کر کے اینٹیں ڈھونے کے بعد چند سکّے لے کے لوٹا ہے۔ طمانیت و کامیابی کے احساس سے چہرے پر مسرت کی لہریں دوڑ رہی ہیں، خوشی کے نغمے گنگناتا ہوا اپنے جھونپڑے میں داخل ہوتا ہے۔ بوسیدہ کپڑوں میں ملبوس، بیوی مسکرا کے استقبال کرتی ہے پیوند لپیٹے ہوئے بچّے دوڑ کر لپٹ جاتے ہیں ہنستے ہوئے سب مل کے کھانا کھا رہے ہیں ـــــــ اُن کے لئے اس "خیرُ الرَّازِقین" نے روٹی کے سادہ ٹکڑوں میں دنیا بھر کی لذّتیں سمیٹ دی ہیں ـــــــ بغیر بستر کے کھردری چارپائی، آغوشِ مادر کی طرح انہیں میٹھی اور مطمئن نیند کی وادیوں میں پہونچا دیتی ہے۔

اور وہ ـــــــ بیٹے کی جدائی میں تڑپتی ہوئی ماں بھی پُرسکون ہوتی جا رہی ہے۔ درد دوا بنتا جا رہا ہے۔ اب وہ گہری نیند سو رہی ہے ـــــــ ایسا لگتا ہے۔ کوئی اس کے اندر رگِ جاں کے قریب بیٹھا ہوا اس کے زخموں پر مرہم رکھ رہا ہے۔

مجھے یقین ہے کہ جب بھی اس کا کوئی بندہ اپنی زندگی کے نشیب و فراز پر منصفانہ نظر ڈالے گا۔ اپنی غلطیوں، کوتاہیوں اور برائیوں کا منصفانہ جائزہ لے گا اور اپنے غم و آلام کے ساتھ اس کی دی ہوئی نعمتوں اور راحتوں کا حساب کرے گا۔ تو اس کا پورا وجود آواز دے گا

لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ (الانبیاء ۸۸)

میرے مالک ـــ تیرے علاوہ کوئی الٰہ نہیں، تو پاک ہے، یقیناً میں خود ظلم کرنے والوں میں ہوں۔
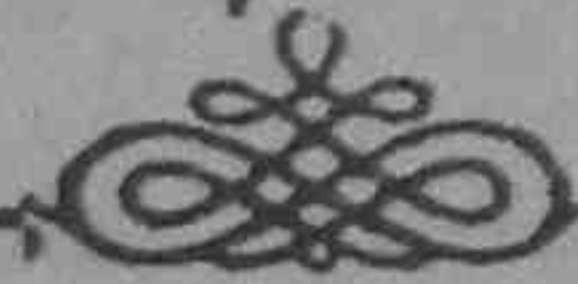
تقدیرِ الٰہی

میری عقل اور میرا وجدان فیصلہ کر چکا ہے کہ:

خدا بھی اکیلا وہی ہے اور خدائی بھی تنہا اسی کی ہے۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ سب کچھ اسی کا ہے اور اسی کے لئے ہے — وہ نہ کسی وزیر کا محتاج ہے نہ کسی مشیر کا ضرورت مند ہے۔ قرآن کریم بار بار ہمیں اسی کائناتی صداقت، تکوینی حقیقت اور آفاقی سچائی کی طرف متوجہ کرتا ہے کہ زمین اور آسمان کا سارا اقتدار صرف اور صرف اس کے ہاتھ میں ہے — سب مخلوق ہیں اکیلا وہی خالق ہے، سب مرزوق ہیں صرف وہ رازق ہے، سب مملوک ہیں اور تنہا وہ مالک ہے۔

★۔ اس کا اقتدار زمین و آسمان کو گھیرے ہوئے ہے — آلِ عمران ۱۸۹
★۔ زمین و آسمان کی سلطنت اللہ ہی کے لئے ہے اور اللہ ہی ہر شے پر قادر ہے۔ بقرہ ۲۵۵
★۔ ہر شے اسی کے قبضۂ قدرت میں ہے — آلِ عمران ۲۶
★۔ کائنات کی کوئی شے اس کے علم اور قدرت سے باہر نہیں۔ آلِ عمران ۲۹
★۔ اس کی کرسئ اقتدار زمین و آسمان کو اپنے حلقے میں لئے ہے۔ بقرہ ۲۵۵
★۔ اس کی سلطنت میں کوئی شریک نہیں — فرقان ۲

اس کی "قدرت" اس کی "ربوبیت" اس کا "علم" ہر شے کے رگ و ریشہ میں جاری و ساری ہے اس کی ان صفات کو نہ اونگھ آتی ہے نہ وہ ایک لمحہ کے لئے معطل ہو سکتی ہیں نہ الگ ہو سکتی ہیں۔

پھول وہی کھلا سکتا ہے جس کی پروردگاری شاخوں کی نس نس میں دل بن کے دھڑک رہی ہے اور پھل وہی لگا سکتا ہے جس کی رزاقیت ہر برگِ گل کی آخری تہوں تک سرگرم عمل ہے اس کے علاوہ کوئی نہیں جو وجود کے ہر نہاں خانے میں موجود ہو۔

وہ کسی کو با اختیار بنا کے بھی بے اختیار نہیں ہو سکتا وہ کسی کو کسی شے کا مالک بنائے تو بھی دست بردار نہیں ہو سکتا۔ وہ کسی کے داخل ہونے سے بے دخل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ وہ بندہ نہیں خدا ہے۔

★۔ اس نے ہر چیز کو اپنی مرضی کے مطابق پیدا کیا ہے اور ہر شے پر اپنا اقتدار رکھے ہوئے ہے ۔______ مائدہ ۱۷

★۔ اس نے ہر شے کو پیدا کیا ہے اور اس کی کارکردگی معین کردی ہی۔ فرقان ۳

★۔ اور اس کا ہر حکم صحیح اندازوں کے مطابق معین ہے ______ احزاب ۳۸

یعنی اس کائنات کی ہر شے اس کی معین کی ہوئی تقدیر کے مطابق اپنی ذمہ داری ادا کر رہی ہے اور کسی کی مجال نہیں ہے کہ جو اس کے مقرر کئے ہوئے نظام کے خلاف سرِ مو انحراف کر سکے۔ اس نے پانی پیاس بجھانے کے لئے پیدا کیا ہے تو پیاس بجھائے گا آگ نہیں لگا سکتا۔ اس نے آگ جلانے کے

لئے پیدا کی ہے تو وہ جلائے گی پیاس نہیں بجھا سکتی۔ مچھلیاں پانی میں تیر سکتی ہیں ہوا میں نہیں اڑ سکتیں اور طائر ہوا میں اڑ سکتے ہیں پانی میں نہیں۔ ناممکن ہے کہ کوئی نیم کے درخت سے آم کا پھل توڑے اور نہیں ہو سکتا کہ آدمی دھتورے کے پودے سے انار پیدا کرے، کبھی نہیں ہو سکتا کہ مرغی کے انڈے سے بکری کا بچہ برآمد ہو جائے، ممکن نہیں کہ آدمی آنکھ کے بجائے دانت سے دیکھنے لگے اور کان کے بجائے آنکھ سے سننے لگے۔

کیسے ہو سکتا ہے کہ ستارے آسمان پر چمکنے کا کام چھوڑ کے لوگوں کی قسمت بنانے اور بگاڑنے لگیں۔ زحل ہو یا مشتری، چاند ہو یا سورج سب اس کے جلال و جبروت کے سامنے سرِ تسلیم جھکائے ہوئے "تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ" کے پابند ہیں۔

★۔ اس نے آسمانوں کو بلند کر کے توازن قائم کر رکھا ہے ۔۔۔۔ الرحمٰن ۷

اس لئے ناممکن ہے کہ فلک پیر اور چرخِ کہن لوگوں پر ستم ڈھائیں اور گردشِ تقدیر کا چکر چلائیں "چرخِ کج رفتار" کی ترکیب انسانوں کی بنائی ہوئی ہے ورنہ ان کی رفتار میں کوئی خرابی نہیں۔ اس لئے کہ اس کائنات کو کسی شعبدہ باز نے نہیں خدائے عادل و حکیم نے پیدا کیا ہے اور اس کا نظام اتنا مضبوط اور مستحکم ہے کہ بال برابر فرق نہیں پیدا ہو سکتا جو چیز جہاں کے لئے بنائی گئی ہے وہیں رہے گی اور جس کام کے لئے بنی ہے وہی کرے گی۔

★۔ مَا تَرٰی فِیۡ خَلۡقِ الرَّحۡمٰنِ مِنۡ تَفٰوُتٍ ؕ فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ هَلۡ

تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ○ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ھُوَ حَسِیْرٌ ○ الملک ۳-۴

رحمٰن کی تخلیق میں کہیں کوئی بد نظمی نہیں دیکھو گے۔ پھر دوبارہ نظر ڈالو کہیں کوئی فطور نہیں پاؤ گے۔ بار بار نگاہ ڈالو تھک کے نگاہ پلٹ آئے گی مگر کوئی عیب نظر نہ آئے گا۔

رات کا الّو ہو یا صبح کا کوّا ــــ راستے کی بلّی ہو یا تیسری کا چاند۔ اس لئے نہیں پیدا کئے گئے ہیں کہ لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کریں۔ تقدیر بلّی اور لومڑی کے ہاتھ میں نہیں قادرِ مطلق کے ہاتھ میں ہے اور اس نے فیصلہ کر دیا ہے کہ:

★ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی۔ کامیابی اسی کو ملیگی جس نے نفس کو پاک کیا۔

کوئی ذرہ اپنے جادۂ حیات اور منصب وجود سے انحراف نہیں کر سکتا۔ اس لئے کہ:

★ وہ ہر شے کی نگرانی کر رہا ہے ــــ المائدہ ۱۱۷

اس نے الّو کو اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ لوگوں کا گھر اجاڑے۔ گھر الّو نہیں انسانوں کی بداعمالیاں اجاڑتی ہیں۔

★ تو کیا ان لوگوں نے زمین کی سیر نہیں کی کہ دیکھیں پہلے والوں کا انجام کیا ہوا ــــ غافر ۴۴

★ کیا یہ لوگ زمین پر گھوم کر نہیں دیکھتے کہ پہلے والوں کا انجام کیا

ہوا جو قوت و اقتدار میں ان سے بہت زیادہ تھے لیکن اللہ نے انھیں بداعمالیوں کی وجہ سے پکڑ لیا۔ (غافر ۲۲)

ہر چیز کا ایک وظیفۂ حیات معین ہے جس کے خلاف میں وہ عمل نہیں کرسکتی۔ جس چیز میں جو وضعی اثر ہے وہی اس سے پیدا ہوگا اس کے برخلاف نہیں۔

تقدیر سازی کا کام اس نے نہ ستاروں کے حوالے کیا ہے نہ ساعتوں کے، نہ دنوں کے حوالے کیا ہے نہ تاریخوں کے۔

* اللہ ہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور وہی ہر چیز کا سرپرست ہے۔ ___ (سورۂ زمر ۶۲)

* اس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی تقدیر معین کردی۔ (فرقان ۳۵)

بدھ، سنیچر، اتوار یا عقرب آسمانی کسی کی قسمت بنا سکتے ہیں نہ بگاڑ سکتے ہیں۔ دنوں اور راتوں میں نہ کوئی اچھے ہیں نہ بُرے سعادت و نحوست انسانی اعمال سے پیدا ہوتی ہے۔

* خیر تیرے ہی ہاتھ میں ہے اور تو ہر چیز پر قادر ہے۔

* تو ہی دن سے رات کو پیدا کرتا ہے اور تو ہی رات سے دن کو نکالتا ہے ___ (آل عمران ۲۶-۲۷)

جب دن اور راتیں اس کے دستِ خیر سے ہیں تو کوئی دن یا کوئی رات شر انگیز، بُری اور منحوس کیسے پیدا ہوسکتی ہے۔ نحوستیں دنوں سے نہیں انسانی

اعمال سے پیدا ہوتی ہیں۔

یہ سب وسوسۂ شیطانی ہے اور شیطان کا کام یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کو توہمات میں مبتلا کرکے ظلمات کی طرف لے جاتا ہے۔

★ شیطان فقر سے خوف زدہ کرتا ہے اور برائیوں کی طرف لیجاتا ہے ——— (بقرہ ۲۶۸)

★ شیطان اپنے ساتھیوں کو خوف زدہ کرتا ہے ——— (آل عمران ۱۷۵)

★ شیطان کا کام ہی دلوں میں وسوسہ ڈالنا ہے ——— (النّاس)

کہو اے پروردگار میں شیطانی وسوسوں سے پناہ مانگتا ہوں۔ (المومنون ۹۷)

الغرض ——— سماج میں پھیلی ہوئی مہمل روایتیں اور افسانے سب شیاطین جن وانس کے لگائے ہوئے دامِ فریب ہیں جس میں گرفتار ہو کے انسان اپنی دنیا بھی برباد کر لیتا ہے اور اپنی آخرت بھی۔

مجھے یقین ہے کہ ہر چیز کو اس حکیم و رحیم خدا نے پیدا کیا ہے ان کی مقدار بھی اور تاثیر بھی۔ اس نے ہر چیز کی قسمت اور تقدیر وظیفۂ حیات اور ذمہ داریاں معین کر دی ہیں۔ اس کے برخلاف دنیا کی کوئی طاقت کسی شے سے کوئی کام نہیں لے سکتی۔ ہر شے کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ ان وسائل سے کام لیا جائے جو اس کے لئے مشروط کئے گئے۔ اللہ کے بنائے نظام میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ امتحان کتابیں پڑھ کے پاس کیا جا سکتا ہے اگربتیاں جلا کے نہیں۔ بیماری کا علاج دوائیں ہیں قبر پر

چادر چڑھانا نہیں۔ برکت حرکت سے پیدا ہوتی ہے چھو منتر سے نہیں۔ نحوست بے عملی سے پیدا ہوتی ہے۔ فلک کج رفتار یا سنیچر اتوار سے نہیں۔ یہی نظامِ قدرت ہے اور یہی تقدیرِ الٰہی ـــــ اور

* اللہ کے طریقۂ کار میں کسی طرح کی تبدیلی ممکن نہیں۔
* اللہ کی سنّت میں ترمیم ناممکن ـــــــ (فاطر ۴۳)
* اللہ کے فیصلوں کو کوئی بدل نہیں سکتا۔ (انعام ۳۴)
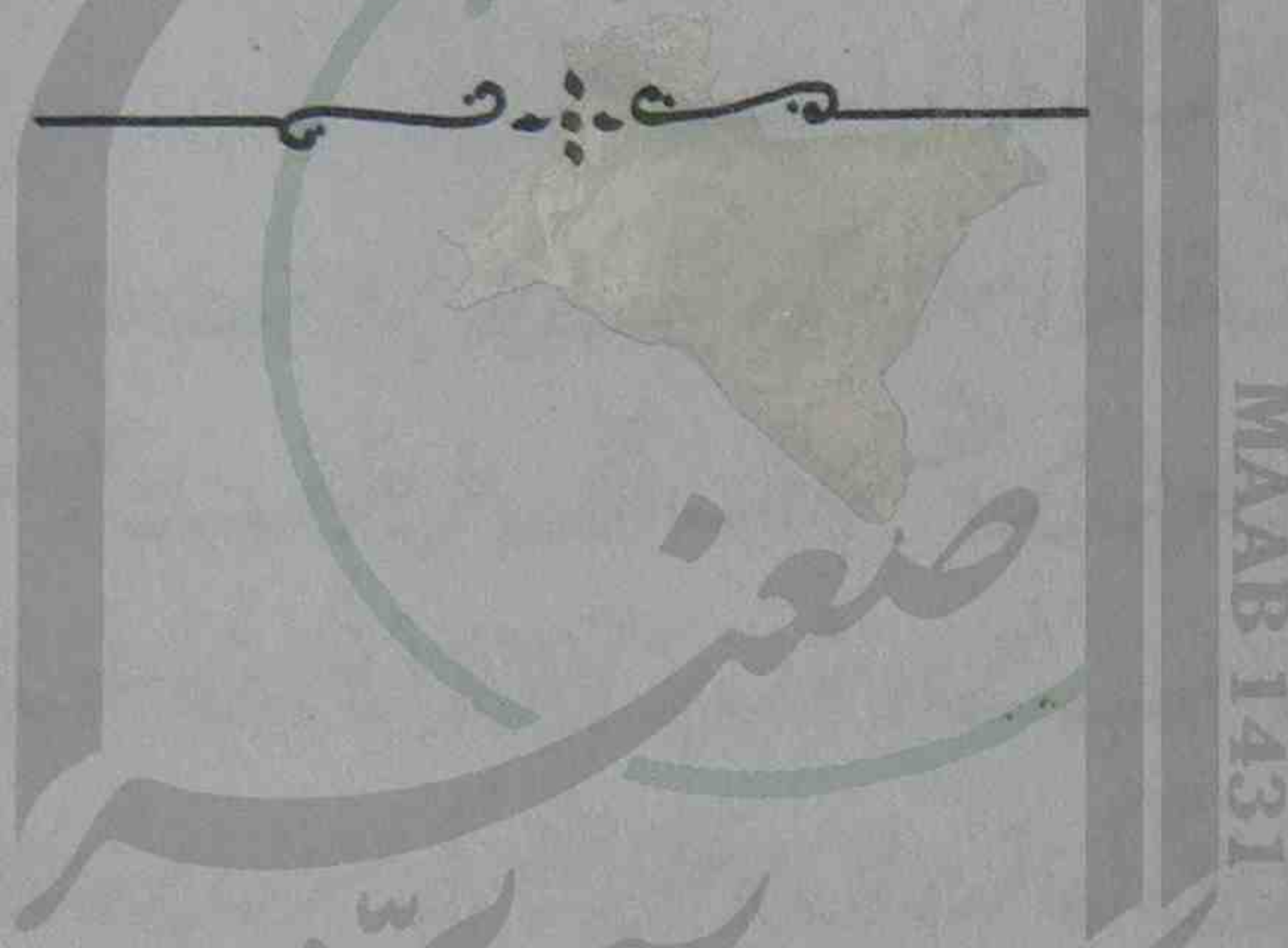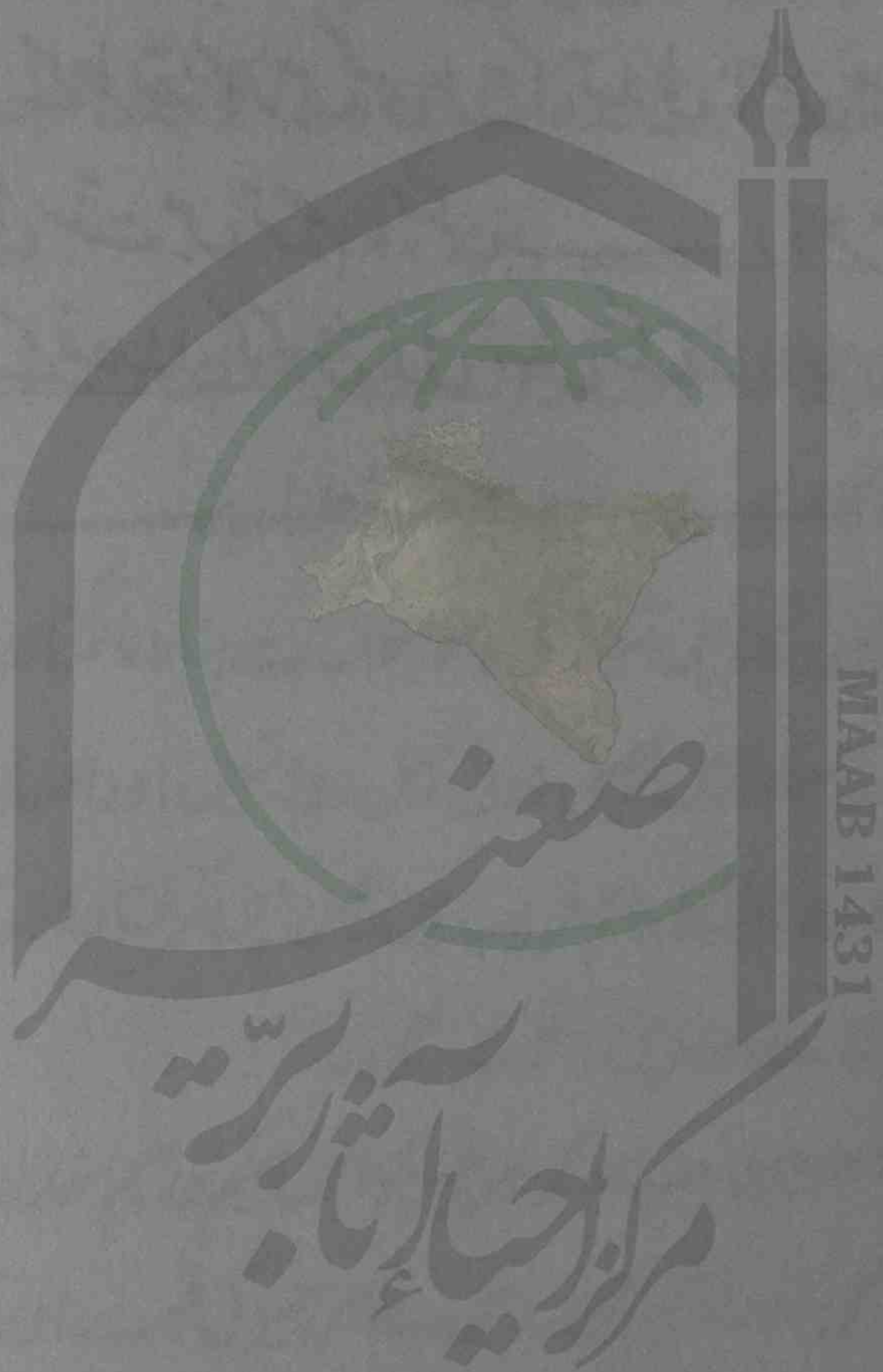
قافلۂ اسلام

میں قدم بڑھاتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ "قرآنی امت" کے اس قافلہ میں شامل ہو جاؤں جسے "امّتِ مسلمہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے جو اللہ و رسولؐ کی اطاعت گذار ہے، جس کا ہر فرد آپس میں بھائی بھائی ہے، جسے قرآن نے خیر امّت کا لقب عطا کیا ہے۔

مگر اس قافلۂ اسلام کو دیکھ کے مجھ پر وحشت طاری ہو جاتی ہے۔ سب الگ الگ گروہوں میں منقسم، الگ الگ طریقوں سے محوِ سفر ہیں، سب کے ہاتھوں میں قرآن ہے، سب کے ہونٹوں پر "لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِؐ" ہے، سب اسی نبیؐ کی امّت ہیں، جو خلقِ عظیم کی منزل پر فائز تھا ـــــ مگر سب ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہہ رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے نبرد آزما ہیں۔ سب ایک دوسرے کی تکفیر کر رہے ہیں۔ سب ایک دوسرے پر الزامات لگا رہے ہیں، سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں۔ ایک دوسرے سے زور آزمائی میں اپنی توانائیاں ضائع کر رہے ہیں۔ جنگلی درندوں کی طرح ایک دوسرے کو بھنبھوڑ رہے ہیں۔ سب کے لئے ایک دوسرے کا خون مباح ہے۔ ایک دوسرے کا گھر جلا رہے ہیں۔ جہاں دیکھئے جس ملک پر نظر ڈالئے ایک طوفان بدتمیزی برپا ہے قتل و غارتگری کا بازار گرم ہے۔

کوئی شیعہ ہے کوئی سُنّی، کوئی بریلوی ہے کوئی دیوبندی، کوئی اہلحدیث ہے کوئی منکرِ حدیث، کوئی حنفی ہے کوئی مالکی، کوئی ہاتھ کھول کے نماز پڑھتا ہے کوئی ہاتھوں کو باندھ کے، کہیں قوالیوں کی محفل جمی ہے، کہیں ہو حق کا بازار گرم۔ کہیں طبلے کی تھاپ پر جذبۂ ایمانی کا مظاہرہ ہو رہا ہے۔ کہیں قبروں کی تجارت باعثِ ثواب، کہیں مزارات کا انہدام واجب، کہیں مشائخ کی قبروں کی ہر اینٹ مجیب الدّعوات، کہیں یارسول اللہ کہنا بھی کفر و شرک، کہیں یادگاروں کے نام پر طرح طرح کی جدّت، کہیں ذکرِ نبیؐ بھی بدعت، کہیں صوفیوں کا میلہ، کہیں تبلیغیوں کا ریلہ، کوئی مغربی تہذیب کا غلام کوئی جبّہ و دستار کا اسیر، سب دنیا کے پیچھے بھاگ رہے ہیں دنیا کسی کے پیچھے نہیں ہے۔

میں سوچتا ہوں!

جب قرآن نسخۂ شفا ہے۔ فلاح و صلاح کا سرچشمہ ہے، امن و امان کا ذمہ دار ہے دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے ــــ پھر یہ امّت جو اللہ کی اس کتاب کی امانت دار ہے۔ قرآن کے اتباع کی دعویدار ہے ــــ اس قدر انتشار و افتراق کا شکار کیوں ہے۔ آپس میں دست و گریباں کیوں ہے دوسری قوموں کے ہاتھوں کیوں ذلیل ہو رہی ہے؟ غیروں کی دستِ نگر کیوں ہے؟ زمانہ اسے ٹھکراتا ہوا کیوں آگے بڑھ رہا ہے؟ امتِ مرحومہ ہونے کے باوجود اس کا خون اتنا سستا کیوں ہے؟ کہ ہر ملک کی زمین اپنی پیاس بجھا رہی ہے، بوسنیا سے لیکر سرزمینِ حرم تک ذلّت کی موت اس کا مقدّر کیوں ہے۔ اس کا دامنِ حیات

علم وحکمت کے خزانوں سے کیوں خالی ہے؟ دوسروں کی مدد کرنے کے بجائے غیروں کے امدادی کیمپوں میں زندگی بسر کرنے پر کیوں مجبور ہے؟ اپنے نزاعی امور میں اللہ ورسولؐ سے رجوع کرنے کے بجائے یورپ وامریکہ کو کیوں آواز دیتی ہے؟ دنیا کی نعمتوں میں اس کا حصہ کیوں نہیں؟ خدائے واحد کے سامنے جھکنے والی جبینوں کو ہزاروں سجدوں سے نجات کیوں نہیں مل رہی ہے؟۔

قرآن کے مخالف تو مریخ ومشتری پر کمندیں ڈال رہے ہیں۔ ناہید وثریا سے باتیں کر رہے ہیں اور قرآن کے ماننے والے اپنے گھر میں بھی غریب الوطن کیوں ہیں؟

دنیا میں پھیلی ہوئی یہ امت کثرتِ تعداد کے باوجود ذلت ورسوائی سے کیوں دوچار ہے۔ ان کی مسجدیں کیوں لوٹ رہی ہیں؟ ان کے عبادت خانے تارِ عنکبوت کی طرح سے زیادہ کیوں کمزور ہیں؟ دنیا کے سیاسی قصاب انھیں بھیڑ بکری کی طرح کیوں استعمال کر رہے ہیں؟ بیت المقدس سے کیوں بھگائے گئے؟ فلسطین سے کیوں نکالے گئے؟ لبنان میں کیوں ان کا خون بہایا گیا؟ بوسنیا میں ان کی نسل کشی کیوں کی گئی؟ افغانستان کیوں ان کا مقتل بنا ہوا ہے؟ پاکستان میں کیوں انکا قتلِ عام ہو رہا ہے؟ عرب وعجم کی سرزمین کیوں ان کے خون میں ڈوبی ہوئی ہے؟

——وہ فراستِ مومن کہاں کھو گئی جو تسخیر کائنات کی ذمہ دار تھی؟ اللہ کے شیروں کو کس نے روباہی سکھادی؟۔

ہونا تو یہ چاہیئے تھا کہ وہ قرآنی امت جس کا نام اللہ نے "مسلم" رکھا ہے۔ تمام قوموں کے درمیان آفتاب وماہتاب کی طرح روشن ہوتی، اندھیروں کی

گود میں جلتے ہوئے چراغ کی طرح ضیا پاشی کرتی۔

قرآن کے خمیر سے پیغمبر اسلامؐ کے ہاتھوں سے تعمیر ہونے والی یہ امّت عظمتِ کردار کی اس بلندی پر ہوتی کہ دوسری قومیں اس کے قدموں میں کھڑی ہو کے علم وعمل کی بھیک لیتیں۔ رضائے الٰہی کی حامل اس امّت کی نگاہوں سے تقدیریں بدل جاتیں، علوم قرآن کی وارث اس قوم کے قدموں کی چاپ سُن کے پہاڑ چیخ پڑتے۔ "لَا تُخۡسِرُوا الۡمِیۡزَانَ" کا اعلان کرنے والی قوم عدل وانصاف کی اس چوٹی پر کھڑی ہوتی کہ دنیا کی قائم کی ہوئی عدالتوں کو پسینہ آجائے، انھیں دیکھ کے زمین اپنے خزانے اگل دیتی، آسمان اپنی نعمتیں ان کے قدموں میں ڈال دیتا، مستضعفین ومحرومینِ عالم ان کا انتظار کرتے کہ وہ آئیں اور ہمیں ظلم وجور کے شکنجوں سے نجات دلائیں۔

اس قرآنی امّت کے پاس اس خستہ حال اور مصیبت زدہ انسانیّت کے درد کا درماں ہوتا۔ وہ مغرب ومشرق کی اندھی تقلید کے بجائے قافلۂ انسانیّت کی رہنمائی کرتی کیونکہ قرآن نے اس کے لئے اعلان کیا تھا۔

"تمھیں وہ بہترین امّت ہو جسے انسانوں کی ہدایت کے لئے میدانِ عمل میں اتارا گیا ہے تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو۔" (آلِ عمران۔ ۱۱۰)

میں سوچتا ہوں!

متعدد سوالات میرے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹا رہے ہیں ـــــ آخر یہ سب کیوں ہوا؟ مسلمانوں کو کس جرم کی سزا مل رہی ہے؟ ـ ...

نقطۂ انحراف کی تلاش

مجھے سوچنا پڑتا ہے! کیا یہی وہ قوم ہے جس کی تعمیر پیغمبرِ اعظمؐ نے کی تھی؟ کیا یہی وہ ملّت ہے جس نے رسولِ اکرمؐ کی آغوشِ تربیت میں پرورش پائی ہے۔؟ کیا اسی امّت کو بروئے کار لانے کے لئے ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السّلام نے اپنی زندگیاں کھپائیں ہیں؟ کیا یہی وہ اسلامی معاشرہ ہے جسے نبیؐ آخر نے جاہلی معاشرے کے کھنڈر پر تعمیر کیا تھا؟ کیا یہی جامعۂ اسلامیؐ انسانیت کی معراجِ آخر ہے؟ کیا قرآن کے خمیر سے اسی قوم کی تعمیر ہوئی ہے جو میرے سامنے ہے۔؟

میں نے دنیا کا مشاہدہ کیا، ایشیائی ملکوں کو دیکھا۔ یورپ و افریقہ کا جائزہ لیا مجھے اسلام کا وہ معاشرہ کہیں نظر نہ آیا۔ جو اللہ کے رنگ میں رنگا ہوا ہو، سیرتِ پیغمبرؐ کے ڈھانچے میں ڈھلا ہوا ہو، افراط و تفریط سے محفوظ صراطِ مستقیم پر گامزن ہو، اخلاق و تہذیب اور علم و معرفت کی بلندی پر قائم ہو۔ جہاں لوگ آپس میں رحمدل اور دشمنوں کے لئے سخت تر ہوں، جہاں لوگ محرابِ عبادت میں آبریشم کی طرح نرم مگر رزم گاہِ حق میں فولاد سے زیادہ سخت ہوں، جہاں ایک کا غم سب کا غم اور ایک کی خوشی سب کی خوشی بن جائے، جہاں خدائے واحد کی بندگی افراد کو جوڑ کے پیکرِ واحد بنا دے، جہاں قرآن کی گواہی کے

مطابق لوگ فوج در فوج حلقۂ اسلام میں داخل ہو رہے ہوں۔ سوچ رہا ہوں۔کیونکہ سب کہہ رہے ہیں کہ مسلمانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے ــــ مگر میں کیا کروں؟ میں تو دیکھتا ہوں کہ جس بستی میں مسلمانوں کی تعداد دس ہزار ہو چکی ہے وہاں قرآن کی روشنی میں اسلامی کردار کے حامل دس افراد بھی نہیں۔یعنی مردم شماری کے کاغذات میں "مسلم" ناموں کا اضافہ ہو رہا ہے مگر جادۂ عمل اور میدان تسلیم میں مسلمانوں کی تعداد کیوں نہیں بڑھ رہی ہے؟

آخر یہ گھٹاؤ کب شروع ہوا؟۔

اس سوال کا نقطۂ آغاز کہاں ہے؟ ــــ کیا الٰہی اعلانات معاذاللہ جھوٹے ہیں؟ کیا قرآن کے وعدے غلط ہیں؟ عقل کہتی ہے یہ ناممکن ہے، ہمارا مالک صادق الوعد ہے۔ممکن نہیں کہ وہ اپنا وعدہ پورا نہ کرے ــــ پھر آخر "اسلام" دنیا و آخرت کی کامیابیوں کا ذریعہ کب بنا تھا؟ زمین پر اسلام کا عادلانہ نظام کب نافذ ہوا تھا؟ اللہ کے نیک بندے کب زمین کے وارث قرار پائے تھے؟۔

متعدد سوالات میرے ذہن کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔یہ سب کیا ہے؟ مسلمانوں کے تمام فرقے کیوں پریشان حال ہیں؟ تمام دنیا میں پھیلی ہوئی امت کیوں ذلت و رسوائی کے سطح پر کھڑی ہے؟ تمام دنیا کا مسلم معاشرہ کیوں بے علمی اور جہالت کا شکار ہے؟ اللہ سے عہد کرنے والے اللہ کے یہ بندے کیوں عہد شکنی کے مجرم ہو رہے ہیں۔قرآن کو ماننے والے قرآنی احکام کی خلاف ورزی

کیوں کر رہے ہیں۔ شراب نوشی، سود خودی، قمار بازی، عصمت فروشی، قتل وغارتگری، بے حیائی و بے غیرتی غرض کسی برائی سے بھی مسلمان محفوظ کیوں نہیں ہیں۔ جو کچھ غیر مسلم معاشرے میں ہو رہا ہے وہی سب کچھ کیوں مسلم معاشرے میں ہو رہا ہے۔؟ کیا یہی انسانیت کا نقطۂ عروج ہے؟ آگے ہلاکت ہی ہلاکت، سناٹا ہی سناٹا، تباہی اور بربادی بس؟۔

کیا قرآن کے وعدے غلط ہیں؟ الٰہی اعلانات معاذاللہ جھوٹے ہیں؟۔ عقل کہتی ہے یہ ناممکن ہے قرآنی اعلان غلط نہیں ہو سکتا، ہمارا مالک صادقُ الوعد ہے، ممکن نہیں کہ وہ اپنا وعدہ نہ پورا کرے! پھر آخر اسلام دنیا و آخرت کی کامیابی کا ذریعہ کب بنے گا؟ زمین کے وارث اللہ کے نیک بندے کب قرار پائیں گے؟ وہ زمانہ کب آئے گا؟ کہ جب اللہ کی زمین بے گناہوں کے خون سے رنگین نہ ہو گی؟ اسلام کا عادلانہ نظام کب نافذ ہو گا؟ انفرادی و اجتماعی مظالم سے انسانیّت کو کب نجات ملے گی؟۔

ہاں! شاید وہ عہدِ زریں گذر چکا ہے وہ دورِ سیادت بیت چکا ہے، وہ زمانۂ رحمت و برکت ماضی کے اندھیروں میں گم ہو چکا ہے ـــــ جب انسانیت کو قرآن کے دامن میں پناہ ملی تھی، جب معاشرے پر عدل و انصاف کی حکمرانی تھی۔ جب حکومتِ الٰہیہ کا پرچم لہرا رہا تھا، جب بے گناہوں کے خون سے زمین رنگین نہیں ہوتی تھی، جب کسی بے کس کی آواز فضاؤں میں ارتعاش پیدا نہیں کر رہی تھی، جب راتوں کا سنّاٹا مظلوموں کی سسکیوں سے ناآشنا ہو چکا

تھا۔ جب انفرادی اور اجتماعی مظالم سے انسانیت کو نجات ملی تھی۔

مگر یہ زمانہ کب آیا تھا؟ وہ معاشرہ کب اور کہاں قائم ہوا تھا؟ جس کا ہر فرد مسرور اور مطمئن تھا۔

میں قرآنی نظام کی تعمیر اور اسلامی زندگی کی تشکیل کے لئے اس عہد کو اپنے لئے نمونہ عمل بنانا چاہتا ہوں اس کی روشنی میں زندگی گذارنا چاہتا ہوں۔ اور ___ اور میں سمجھنا چاہتا ہوں کہ اسلام کا وہ معیاری معاشرہ، وہ اسلامی ماحول ___ اس فتنہ وفساد سے بھرے ہوئے غیر قرآنی معاشرے میں کب اور کیوں تبدیل ہوگیا؟ آخر مسلمانوں نے وہ کون سی غلطی کی تھی جس کی سزا آج تک انھیں مل رہی ہے؟ "عالمِ انسانیت" اسلام کے فیض سے محروم کیوں ہوگیا ہے؟ وہ نقطۂ انحراف کہاں ہے؟ جس نے مسلمانوں کی تاریخ کو ہلاکت وتباہی کے دہانے پر ڈھکیل دیا ہے۔ وہ کون سا حادثہ تھا جس نے سیکڑوں حادثات کو جنم دیا؟۔

مجھے اس نقطۂ انحراف، اس موڑ کا پتہ لگانا چاہیئے جہاں سے امت سیدھا راستہ چھوڑ کے غلط راستے پر چل پڑی۔ تاکہ غلط اور صحیح راستوں کی پہچان تو حاصل ہو ___ میں جانتا ہوں کہ مسافر اگر راستہ بھٹک جائے تو اسے آگے بڑھنے کے بجائے اس موڑ پر پلٹنا چاہیئے جہاں سے راستہ بھولا ہے تاکہ صحیح سمت میں سفر جاری رکھ سکے ___ نقطۂ انحراف کا پتہ لگائے بغیر آگے بڑھنے میں ایک گمراہی سے نکل کر دوسری گمراہی میں جا پڑنے کا خطرہ ہے۔ میرے مالک

نے مجھے "اٹکل پچو" عمل سے منع کیا ہے۔

اب میں تاریخ کی انگلی تھام کے ماضی کی طرف سفر کر رہا ہوں۔

مجھے اس عہدِ خیر و برکت کی تلاش اور دورِ صلاح و فلاح کی جستجو ہے جب اسلامی قوانین پوری طرح معاشرے پر حکمراں تھے اور اسلام کا عادلانہ نظام پوری آب و تاب کے ساتھ دنیا کی نگاہوں کے سامنے تھا۔ جب مسلمانوں کی تاریخ اللہ و رسولؐ کی مرضی کے مطابق سفر کر رہی تھی۔ جب ظلم و جور، استعمار و استحصال، فریب و دغا کا خاتمہ ہو چکا تھا۔ جب اخلاقی بیماریوں کے جراثیم بڑھنے کے بجائے ختم ہو رہے تھے، جب ہر فرد کو اپنی صلاحیتوں کے مطابق اپنی شخصیتوں کی تعمیر کے مواقع حاصل تھے، جب فضیلتوں کا معیار تقویٰ الٰہی تھا، جب عظمتوں کی واحد بنیاد طاقت و اقتدار کے بجائے خوفِ خدا اور پاکیزگی کردار تھی ...

ماضی کی طرف

یہ پندرہویں صدی ہے ــــ

بے گناہوں کے خون سے رنگین، مسلمانوں کی لاشوں پر چل کے گذرتی ہوئی صدی ــــ ایشیا سے افریقہ اور افریقہ سے یورپ تک ہر جگہ مسلمانوں کا خون بہہ رہا ہے۔ ظلم و تشدّد، قتل و غارتگری، کذب و افترا، اضعاف واستکبار کی چکیوں میں پستی ہوئی انسانیت، جہالت و بدحالی کی تاریکی میں ڈوبی ہوئی یہ دنیا تباہی اور ہلاکت کے دہانے پر کھڑی ہے ــــ بالخصوص مسلم بستیاں، قتل و غارتگری کا مرکز بنی ہوئی ہیں۔

بوسینیا، فلسطین، اردن، عراق، افغانستان، پاکستان، ہندوستان، جہاں دیکھئے ــــ مسلمانوں کے خون کی کوئی قیمت نہیں، لاکھوں فلسطینی مسلمان، لاکھوں عراقی مسلمان، لاکھوں بوسنیائی مسلمان حالیہ برسوں میں کام آچکے ہیں۔ خون کے دریا بہہ رہے ہیں مگر زمین کی پیاس نہیں بجھ رہی ہے۔

میں پیچھے کی طرف ماضی کی وادیوں میں اپنی رفتار تیز کر دیتا ہوں۔

یہ چودھویں صدی ہے۔ تہذیبوں کے انہدام کی صدی، نظریات کے تصادم کی صدی ــــ ایٹم بم کے دھماکوں سے گونجتی ہوئی صدی ــ مسلم ملکوں پر صیہونیت کے تسلّط کا زمانہ، مغربی تہذیب کا عروج، اسلام کی

بے بسی، نئے فلسفوں کے ہاتھوں اسلامی افکار کی پامالی۔ مسلمانوں کا قتلِ عام، توحید کے نام پر مسلمانوں کی تکفیر، بدعت کے نام پر تاریخی آثار کا انہدام۔ دو، دو جنگ عظیم کی چکیوں میں پستی ہوئی انسانیت۔ جمہوریت اور اشتراکیت کا انسانی لاشوں پر شیطانی رقص۔ ملک تقسیم ہو رہے ہیں نام نہاد قوموں کے درمیان اللہ کی زمین کے ٹکڑے ہو رہے ہیں مگر اللہ کے دین کو ایک ٹکڑا دینے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

اور یہ تیرھویں صدی ہے۔

شہنشاہیت اور سامراجیت کا زمانہ۔ تخت سلطنت کے نیچے بہتا انسانی خون۔ استکبار اور اقتدار کی "گھڑ دوڑ" میں کچلتے ہوئے عوام۔ تاج ایک سر سے دوسرے سر پر منتقل ہو رہے ہیں۔ تخت اور پائے تخت تبدیل ہو رہے ہیں مگر بے کسوں کے آنسو پوچھنے والا کوئی نہیں۔ مظلوموں کی فریاد سننے والا کوئی نہیں۔

یہ بارہویں صدی ہے۔

سلطنتوں کا ٹکراؤ، لشکروں کا یلغار۔ شہر تاراج کئے جا رہے ہیں، بستیاں اجاڑی جا رہی ہیں، استکبار اللہ کے بندوں کو غلام بنا رہا ہے۔ شاہی محل میں خدمت کے خواجہ سرا پیدا کئے جا رہے ہیں۔

میں تاریخ کے اوراق الٹ رہا ہوں۔ مگر کوئی عہد، کوئی صدی تو درکنار، کوئی سال اور کوئی دن ایسا نہیں دکھائی دیتا جو بے گناہوں کے

خون کے دھبوں سے رنگین نہ نظر آتا ہوں، جب انسانیت کو محروم نہ کیا گیا ہو، مقدس جذبوں کا مذاق نہ اڑایا گیا ہو۔۔ جب عصمتیں نہ لوٹی گئی ہوں، جب گودیاں نہ اجاڑی گئی ہوں، جب انسانیت کی لاش پر استکبار نے رقص نہ کیا ہو۔۔ مجھے تو فرعون و نمرود، چنگیز و ہلاکو بدلے ہوئے ناموں کے ساتھ تاریخ کے ہر دور میں دکھائی دیتے ہیں۔

میں سوچتا ہوں! کہ عام جامعہ انسانی ہمیشہ ظلم و جور کا شکار رہا ہے اور رہے گا۔۔ اگر اسلامی قوانین کی برکتوں اور اسلام کے فیضانِ رحمت کا نظارہ کرنا ہے تو اس سلسلۂ خلافت کا مطالعہ کرنا چاہیئے جس کا ابتدائی سِرا عہدِ رسالت سے جُڑا ہوا ہے۔

میں بڑی امیدوں کے ساتھ بڑے احترام اور عقیدت سے تاریخِ خلافت کا جائزہ لیتا ہوں۔۔ میری نگاہ ٹرکی کے قبرستان سے جہاں مارچ ۱۹۲۴ء کو خلافت مسلمین کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔۔ سقیفہ بنی ساعدہ تک سفر کرتی جہاں صحابیتؓ کے مقدس ہاتھوں کے ذریعے اسے عالمِ وجود میں لایا گیا تھا۔

میرے سامنے خلفائے مسلمین کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس سلسلے میں ہر سائز کے خلفاء نظر آتے ہیں، جاہل بھی، عالم بھی، عیاش بھی، جلاّد صفت بھی، کلامی بحثوں کے دلدادہ بھی، فلسفیانہ موشگافیوں کے شائق بھی۔

چار خلفائے راشدین، تقریباً ڈیڑھ درجن اموی خلفاء تقریباً ۳۴، ۳۵

خلفاءِ بنی عباس پھر فاطمین، اور پھر مصریین، ۱۶، ۱۷ عباسی خلفاء۔ پھر سلسلۂ عثمانیہ کے خلفائے اندلس تقریباً ۲۸۔

کبھی مرکزِ خلافت ایک کبھی کئی کئی خلیفہ بیک وقت مسندِ خلافت پر جلوہ افروز۔ شام میں اموی، بغداد میں عباسی، مصر میں فاطمی، اندلس میں عثمانی خلافت کا پرچم لہرایا مگر غریب اسلام کو کہیں پناہ نہ ملی ــــــ کبھی خلافت کو جمہور کا عطیہ سمجھا گیا کبھی خداداد مملکت، کبھی موروثی جائداد، کبھی "لاٹھی کی بھینس" ــــــ رسم بیعت ضرور جاری رہی مگر اس کے پیچھے وعدہ وعید، ترغیب و تحریص، خوف و دہشت، قتل وغارتگری کی کارفرمائی نظر آتی ہے ــــــ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ "بیعت" پہلے ہو اور مسندِ اقتدار پر قبضہ بعد میں حاصل ہو ــــــ ہمیشہ یہی ہوتا رہا اقتدار پر قبضہ کر کے بیعت حاصل کر لی گئی ــــــ آج کی غیر اسلامی جمہوریت میں بھی جبراً ووٹ حاصل کر لینے کا وہ سلیقہ نہیں جو خلفاءِ مسلمین کو میسّر تھا۔

میں تاریخ کے آئینے میں صاف دیکھ رہا ہوں کہ اموی اور عباسی شاہزادوں کے درمیان خلافت کی گیند اُچھل رہی ہے، کبھی اِدھر کبھی اُدھر، جس نے چاہا اس پر قبضہ کر لیا۔

کب کون خلیفہ بنے گا اس کا فیصلہ اتفاقات وحوادث کے ہاتھوں میں تھا ــــــ نہ کوئی اصول نہ کوئی ایسا آئین جسے منطقی جواز حاصل ہو ــــــ اس عجیب و غریب مسندِ اقتدار پر قبضہ کرنے کے لئے بھائی بھائی کو قتل کر رہا ہے

اور بیٹا باپ کو دھکے لگا رہا ہے۔

میں جب خلافت کی قبا کا دامن ہٹا کے دیکھتا ہوں، ـــــ تو ملوکیت کا ایسا بھیانک چہرہ دکھائی دیتا ہے کہ چنگیز و ہلاکو بھی شرما جائیں۔ جنسی لذّت کی وہ دیوانگی کہ آج کی برہنہ تہذیب بھی پناہ مانگے۔ استکبار کا ایسا مظاہرہ کہ شداد و نمرود کی روح کو بھی پسینہ آجائے ـــــ عیش ونشاط کی محفلیں آراستہ ہیں، فسق وفجور اور لہو ولعب کا بازار گرم ہے۔ ساغروں کی کھنک سے گونجتا ہوا، شراب کی بو میں بسا ہوا ایوانِ خلافت آواز دے رہا ہے ے

"بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست"

اس عہد رفتہ کے آئینے میں ایسی ایسی تصویریں نظر آتی ہیں کہ غیرت انسانی شرم سے آنکھیں بند کرلے۔

دستِ خلافت اولادِ پیغمبرؐ کا قتلِ عام کر رہا ہے۔ مدینۂ رسولؐ تاراج کیا جا رہا ہے۔ قبرِ پیغمبرؐ پر گھوڑے باندھے جا رہے ہیں۔ مدینے کی کنواری لڑکیاں ماں بن رہی ہیں۔ حفّاظ تہہِ تیغ کئے جا رہے ہیں۔ خانۂ خدا پر سنگ باری ہو رہی ہے۔ غلافِ کعبہ جل رہا ہے ـــــ کنیز کو بسترِ مباشرت سے اٹھا کے عمامہ پنہا کے محرابِ عبادت میں امامِ جماعت بنایا جا رہا ہے۔ (الخمیس)

قرآن پھاڑا جا رہا ہے۔ اللہ! کیسے کیسے تماشے اس پردۂ زنگاری میں نظر آ رہے ہیں۔

:- علامہ سیوطی کے الفاظ میں :-

"دولت کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ باب سماشیہ سے دارالخلافت تک ایک لاکھ ساٹھ ہزار مسلح افواج کھڑی ہے۔ فوج کے آگے سات ہزار خادم دست بستہ کھڑے ہیں ان کے بعد سات سو حاجبوں کی قطار ہے۔ دارالخلافت کی دیوار پر اٹھائیس ہزار ریشمی پردے پڑے ہیں اور بائیس ہزار دوسرے اعلیٰ قسم کے پردے پڑے تھے۔ مقتدر باللہ (خلیفۂ وقت) دجلہ کے کنارے "آبنوس" کے تخت پر تاج پہنے جلوہ فرما تھا۔ بدن پر سفید ریشمی لباس جس پر سونے کا کام بنا تھا، تختِ منقش پر سنہرا فرش جس کی جھالر میں تسبیح کے دانوں کے برابر جواہرات لٹک رہے تھے۔ پانچ شہزادے سامنے، تین داہنے اور دو بائیں بیٹھے تھے۔

غربت کا یہ عالم ہے کہ :

باہمی کشمکش کا بغداد کی رعایا اور ان کی معاشی حالت پر نہایت بُرا اثر پڑا، وہ کتے، بلی اور مردار کھانے پر مجبور ہو گئے تھے۔"

[ماخوذ "تاریخ بغداد بحوالہ مسلمانوں کا ختم مملکت"
مؤلفہ محمد علی ملا صدیقی، فاضلِ دیوبند]
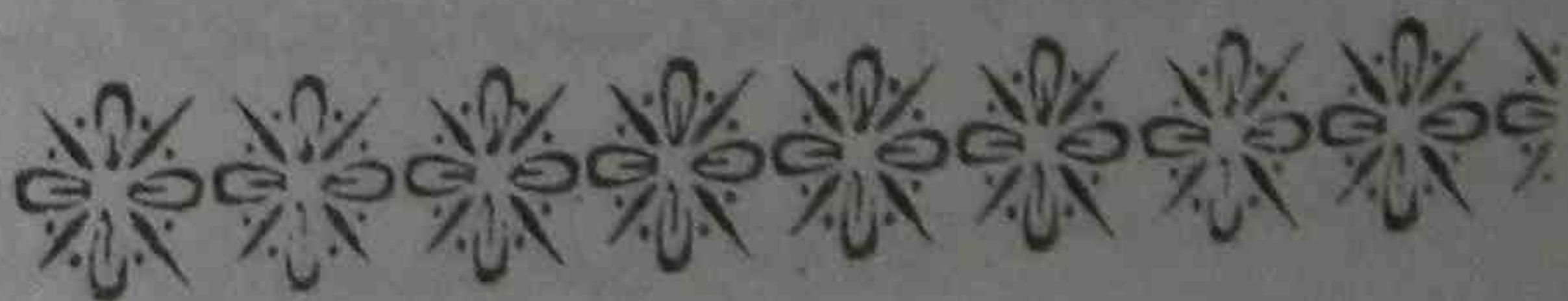
میں جب بھی سلسلۂ خلافت پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اس اسٹیج پر ایسے ایسے ڈرامے کھیلے گئے ہیں کہ جن کا جواب دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عجیب و غریب طرزِ جہاں بانی کے لئے قصیدہ لکھوں یا مرثیہ ـــــ اُسے دیکھ کے ہنسوں یا رووُں ـــــ ؟ تاریخ انسانی ایسے نادر الوُجود کرداروں سے خالی تھی۔

حجّاج قتل کرنے اور خون بہانے میں لذّت حاصل کرتا تھا۔ (المسعودی)

سلیمان ابن عبدالملک بیس[۲] بکری کے بھُنے ہوئے بچّے ناشتے میں نوش فرماتے تھے ان کی غذا پچاس عراقی رَطَل تھی۔ (المسعودی)

ہشام ابن عبدالملک بھینگا، درشت، اور سخت بدخو تھا، گھوڑ دوڑ کا شائق تھا۔ (المسعودی)

ولید۔ شرابی، گانے بجانے کا رَسیا تھا ـــ ابن عائشہ داستان گو اور گویا تھا۔ اس نے گانا گایا تو اتنا خوش ہوا کہ اُن کے تمام اعضاء کو بوسہ دیا یہاں تک کہ اس کے عضوِ تناسل کو چومنا چاہا تو ابن عائشہ نے آلہ تناسل چھپا لیا۔ ولید نے کہا خدا کی قسم میں اسے بغیر بوسہ دیے نہیں ٹلوں گا۔ پھر اسے ننگا کیا گیا اور اس نے اس کے سرے کو بوسہ دیا۔ پھر اپنے کپڑے اتار کے برہنہ ہو گیا۔ (المسعودی صفحہ ۲۶۶ حصہ سوم)

ایک روز اس نے یہ آیت پڑھی ـــ وَاسْتَفْتَحُوا وَخَابَ كُلُّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ

• اور نامراد ہوا ہر سرکش عناد کرنے والا۔ (ابراہیم ۱۵)

تو اس نے قرآن پاک منگا کے اسے تیروں کے لئے بطور ہدف نصب کیا اور یہ شعر پڑھتے ہوئے اسے تیر مارنے لگا۔

"تو ہر جابر اور حق کے مخالف کو ڈراتا ہے تو دیکھ لے کہ میں حق کا مخالف اور جابر ہوں جب تو حشر کے روز اپنے رب کے پاس جانا تو کہہ دینا کہ مجھے ولید نے پھاڑا ہے۔"

(المسعودی حصہ سوم، صفحہ ۲۶۹)

میں گھبرا کے خلافت کے اس اسٹیج سے اپنی نگاہیں ہٹا لیتا ہوں ـــــ میرے دل و دماغ میں ہیجان برپا ہے ـــــ میں تاریخ سے سوال کرتا ہوں کہ مسند خلافت پر بیٹھ کے مسلمانوں کے سیاسی شعور نے عالمِ بشریت کو کیا دیا ـــــ تاریخ جواب دیتی ہے خوں ریز داستانیں، جنگ و جدل کے مرقع، عیاشی کے دلچسپ طریقے، ذہنی عیّاشی کیلئے کلامی بحثیں اسلام کی برتری ثابت کرنے کے لئے چھوٹی چھوٹی حکومتوں کی تشکیل۔ کچھ شاندار عمارتیں جو آج آثارِ قدیمہ بن چکی ہیں۔

اور ـــــ اس عہدِ خلافت کا سب سے بڑا کارنامہ، اسلامی شعور، اور قرآنی فکر کی حفاظت کے لئے ملّائیت کی ایجاد ہے ـــــ ملّائیت نے انسانیت پر یہ احسان کیا کہ چادریں چڑھانے کے لئے قبریں، مصیبتوں اور بلاؤں سے نجات پانے کے لئے اوراد و وظائف، بیماریوں کے علاج کے لئے گنڈے اور تعویذ

اللہ کے بندوں کو خوف زدہ رکھنے کے لئے "توہمات" کا ایک طومار مہیا کر دیا۔ برہمنزم اور پادری ازم سے کہیں زیادہ مذہبی استحصال کے دروازے کھول دئے ـــــ الغرض خلافت و اسلام کے عادلانہ نظام کی لاش پر عیش کدے تعمیر کرتی رہی اور ملائیت اسلامی شعور کے مدفن پر خانقاہیں آباد کرتی رہی۔

میرا بھی دل یہی چاہتا ہے کہ تمام مسلمانوں کی طرح میں بھی نعرہ لگاؤں کہ ہمارا ماضی بہت شاندار تھا، مریخ و مشتری ہماری چوکھٹ پر سجدہ کرتے تھے انسانیت کو ہمارے قدموں میں پناہ ملی تھی۔ عدل و انصاف کا پرچم ہمارے ہاتھوں میں تھا جس کے سائے میں نہ کوئی محروم تھا نہ مستضعف، نہ استکبار تھا نہ استعمار، نہ کوئی مصیبت زدہ رہ گیا تھا نہ فاقہ کش، ـــــ ہم نے عدلِ اجتماعی کا وہ مثالی معاشرہ قائم کر دیا تھا جس کا خواب انسانیت ہمیشہ سے دیکھتی آرہی ہے ـــــ خوفِ خدا کے سانچہ میں ڈھلا ہوا سماج ـــــ جس میں نہ چوری ہوتی تھی نہ ڈاکہ پڑتا تھا، نہ قتل ہوتا تھا نہ لوٹ مار، نہ کوئی غریب تھا نہ امیر ـــــ نہ کوئی کالا تھا نہ گورا سب اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ کنگھی کے دندانوں کی طرح نہ کوئی چھوٹا تھا نہ بڑا صرف تقوائے الٰہی فضیلت کی بنیاد تھا۔

جہاں محمود و ایاز کو ایک ہی صف میں کھڑا کر دینا کوئی کمال نہیں تھا کیوں کہ محمود ایاز، مندریں بھی ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں اور کلیسا میں بھی ـــــ بلکہ ہمارا کمال یہ تھا کہ ہمارے سماج میں نہ کوئی محمود پیدا

ہوتا تھا نہ ایاز نہ کوئی بندہ نہ کوئی بندہ نواز ——

مگر میں کیا کروں —— ؟ مجھے اب تک عہدِ پیغمبرؐ کے علاوہ مسلمانوں کی تاریخ کا کوئی ایک صفحہ بھی ایسا نہیں مل سکا جو بے گناہوں کے خون سے داغدار نہ ہو —— میں مسلمان ہوں، مجھے سچ بولنے کا حکم دیا گیا ہے۔ میرا ضمیر مجھے اجازت نہیں دیتا کہ میں، "تاریخ و آثار، اور عقل و منطق کے خلاف، شاندار ماضی کا مفروضہ بت" بنا کے اس پر عقیدت پھول چڑھاتا رہوں۔

شاعرِ مشرق علامہ اقبالؔ نے بھی خطبہ مدراس میں یہی کہا تھا۔

"بحیثیت ایک نظام مدنیّت ابھی تک اسلام ہمارے سامنے نہیں آیا۔ یہ نظام مدنیّت ایک نہ ایک دن سامنے آئے گا۔ لیکن اس وقت جب مسلمانوں کا شعورِ ملّی بیدار ہو گا، اور وہ سمجھیں گے کہ حیات عبارت ہے ایک سیاسی، اجتماعی ہیئت سے نہ کہ محض مذہبی، اخلاقی نظام سے۔" [۱]

مسلمان کہتے ہیں [۱] کہ اس سلسلۂ خلافت میں اگر معاویہ، یزید، مروانؔ، عبدالملک، ابوولید، سلیمان، ہشام، یزید ابن ولید، ابراہیم ابن ولید مروانؔ ابن محمد جیسے اموی خلفا تختِ خلافت پر متمکّن ہوئے اور ابوالعباسؔ، ابوجعفر، المہدی، الہادی، ہارون رشید، امین، مامونؔ، المعتصم، الواثق، المتوکل، المنتصر، المستعین، المعتز، المہتدی، المعتمد، المعضد، المقتدر، الراضی

---

[۱] ملفوظات اقبال کی ادبی اہمیت —— بحوالہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ دسمبر ۱۹۹۹ء۔

باللہ، المقتضی باللہ، المطیع باللہ، الطائع باللہ، القادر، القائم باللہ، المقتدی باللہ
المستظہر، المسترشد، الرشید، المقتضی، المستنجد، المستضی، الناصر، الظاہر باللہ،
المستنصر باللہ، المعتصم باللہ، جیسے عباسی خلفائے اسلام مسندِ خلافت پر جلوہ افروز ہوئے، یا
جہاں ۲۸ عثمانی خلفاء نے ترکی میں دادِ خلافت دی ہیں اس سلسلۂ خلافت میں
حضرت عمر ابن عبدالعزیز بھی تو پیدا ہوئے ہیں جن کے عدل و انصاف کا ڈنکا آج
تک بج رہا ہے۔ جن کے تقویٰ اور خدا ترسی کا چرچا آج تک باقی ہے جن کی عبادت
اور سادگی آج بھی لوگوں کے وردِ زبان ہے ـــــــــ تو مجھے اپنی
قوم کی سادہ لوحی پر ہنسی آتی ہے ـــ ذکر ہے ایک ایسے نظامِ حکومت کی
عظمت کا جو انسانیت کے تمام دکھوں، تمام مصیبتوں کو ہمیشہ کے لئے ختم کرنے کا
دعویدار تھا، جسے ظلم و جور سے بھری ہوئی دنیا کے آخری علاج کی حیثیت سے پیش
کیا گیا تھا ـــــ ساڑھے تیرہ سو سال کے طویل زمانے میں پھیلے ہوئے
اس نظام کی صداقت کی دلیل صرف ایک نام جس کا عہدِ خلافت صرف ۲ سال تھا۔
دنیا بھر کے سلاطین، حکمرانوں، قیصروں اور کسراؤں کی کوئی ایسی نسل نہیں
جس میں ایک آدھ، رحم دل اور انصاف پسند افراد کو اللہ نے نہ پیدا کر دیا ہو ـــ
دورِ جاہلیت کی کوکھ سے بھی نوشیرواں اور حاتم طائی جیسے عادل اور رحم دل انسان پیدا ہوئے ہیں۔
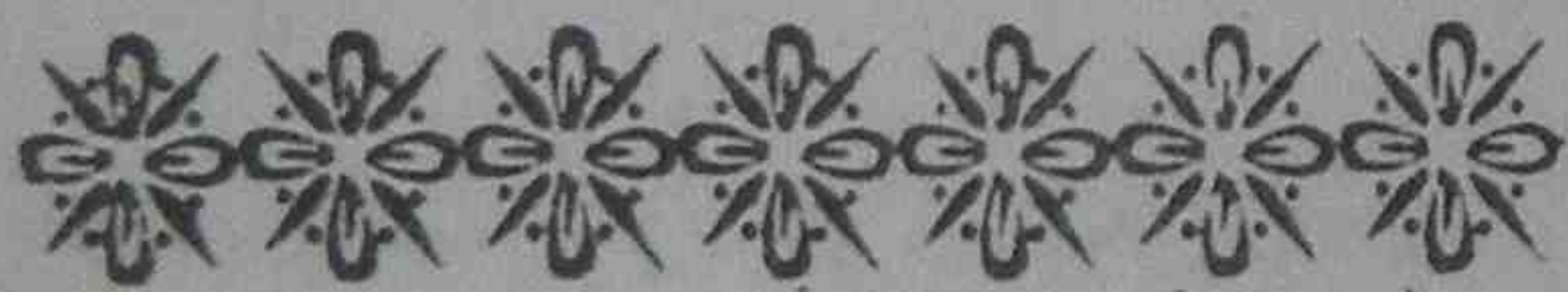
خلافتِ راشدہ

اب میں مسلمانوں کی تاریخ کے اس مقدّس باب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں جسے "خلافت راشدہ" کہا جاتا ہے۔ جس کے پُروقار ماتھے پر "علیٰ مِنھاجِ النُّبُوّۃ" کا لیبل لگا ہوا ہے، یعنی یہ عہد عہدِ پیغمبرؐ کی ہو بہو شبیہ تھا۔ پیغمبرؐ کے قائم کئے ہوئے اسلامی سماج کا مکمّل نمونہ ہو گا۔ مجھے یقین ہے کہ اس عہد کا دامن ہر طرح کے ظلم و جور کے داغ دھبّوں سے پاک ہو گا —— اس لئے کہ پیغمبر اسلامؐ کے تربیت یافتہ افراد کا عہد ہے۔ یہ اس منتخب نسل کا زمانہ ہے جس سے قرآن نے سب سے پہلے گفتگو کی تھی —— یہ ان اصحاب کرام کا دور ہے جنہوں نے پیغمبر اکرمؐ سے براہِ راست فیض حاصل کیا تھا۔ اور ان امہات المومنین کا زمانہ ہے جو مرسلِ اعظمؐ کی شریکِ حیات کی حیثیت سے زندگی گذار چکی ہیں۔ سلسلۂ نبوّت کا اختتام اس دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ یقیناً یہ خیر و برکت کا عہد ہو گا۔

یا اللہ میری مدد کر —— اعتماد کے آبگینے ٹوٹ رہے ہیں اس مقدّس تاریخ کا پہلا ہی صفحہ یعنی امّت کو عہد پیغمبرؐ سے جوڑنے والی پہلی کڑی —— مجھے حیرت و استعجاب کے سمندر میں پھینک دیتا ہے۔

اللہ کے رسولؐ کو دنیا سے رخصت ہوئے چند دن بھی نہیں چند گھنٹے گزرے ہیں ہے کہ خانۂ نبوّت سے بلند ہونے والی ان کی پارۂ جگر فاطمہ زہراؑ کی درد بھری آواز میرے دل کو زخمی کر رہی ہے۔

"بابا! آپ کے بعد مجھ پر وہ مصیبتیں پڑیں جو اگر دنوں پر پڑتیں تو وہ اندھیری راتوں میں بدل جاتے"

مجھے! تاریخ کی صدائے بازگشت میں، بنتِ رسولؐ فاطمہؑ زہراؑ کے دروازے کی ٹوٹنے کی آواز بھی سنائی دے رہی ہے ـــ تاریخ کے پس منظر میں خانۂ علیؑ کو جلانے کے لئے سلگائی جلانے والی آگ کا دھواں بھی دکھائی دے رہا ہے۔

مجھے ایسا لگتا ہے کہ تاریخ کی کتابیں میرے اسلامی ضمیر اور انسانی احساسات کو طمانچے لگا رہی ہوں ذہنی فرار حاصل کرنے کے لئے کوئی راستہ نہیں۔ تاریخ طبری، عقد الفرید، مروّج الذہب المسعودی، ابو الفداء، مؤرخ ابن قتیبہ، کنز العمال، وغیرہ بے شمار تاریخی کتابیں مجھے گھیرے ہوئے آواز دے رہی ہیں ـــ علیؑ گرفتار کر لئے گئے، فاطمہؑ قبر پیغمبرؐ پر فریاد کر رہی ہیں ـــ خلیفۂ اوّل یارِ غار پیغمبر ہارونِ پیغمبرؐ سے فرما رہے ہیں۔ یا علیؑ میں تمہیں قتل کر دوں گا۔ فاروق اعظم کی آواز آرہی ہے۔ علیؑ کو جانے نہ دیجئے

حدیثوں کی کتابیں بھی میرا دامن پکڑے ہوئے ہیں، صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد، ام المومنین حضرت عائشہ کی آواز میں خبر دے رہی ہیں ـــ فاطمہؑ کو ان کے باپ رسول خداؐ کی میراث نہیں دی گئی، وہ مطالبہ کر رہی ہیں،

خلیفۂ پیغمبرؐ اس مطالبہ کو مسترد کر رہے ہیں ـــــ بیٹی باپ کی طرف سے باغ فدک کے ہبہ ہونے کی خبر دیتی ہے مگر خلیفۃ المسلمین فاطمہؑ اور ان کے گواہوں کی تکذیب فرما رہے ہیں ـــــ ایک طرف صدّیق ـــــ ایک طرف صدّیقہ ـــــ دونوں ایک دوسرے کی تکذیب کر رہے ہیں۔

یا رسول اللہؐ کیا کروں ـــ؟ ایک طرف آپ کے اصحاب ہیں۔ ایک طرف آپ کی اولاد ہے۔ ایک طرف بزمِ پیغمبرؐ کے تربیت یافتہ کردار ـــــ دوسری طرف آغوشِ پیغمبرؐ میں پلی ہوئی سیرتیں۔ ایک طرف صحبت پیغمبرؐ میں زندگی گذارنے والے ـــــ دوسری طرف توارثِ صفات (Gene heredity) کے ذریعہ پیغمبر کے خصائل و اوصاف، مزاج اور طبیعت کے وارث ـــــ

یا اللہ! مجھے قوّتِ فیصلہ عطا کر دے، مجھے وہی حوصلہ دیدے جو اُن شہدائے بدر و احد کو عطا کیا تھا جو حق و صداقت کے خلاف باپ اور بھائی سے بھی کسی طرح کی رعایت پر تیار نہ تھے۔

فدک ـــــ فدک، یہ لفظ میری روح کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ دماغ پر ہتھوڑے برساتا ہے ـــ تاریخ کے آئینے میں میری نگاہِ تصوّر دیکھ رہی ہے کہ مرسلِ اعظمؐ کی بیٹی جو کم عمری میں اس قدر لاغر و کمزور ہو چکی ہے کہ عصا کا سہارا لئے خلیفۃ المسلمین کے سامنے کھڑی ہوئی فریاد کر رہی ہے۔

میری عقل فیصلہ کرتی ہے کہ تین صورتوں کے علاوہ چوتھی صورت ممکن نہیں۔

یا حضرت ابوبکر کذب بیانی سے کام لے رہے تھے۔

یا حضرت فاطمہ زہراؑ غلط بیانی کر رہی تھیں۔ (معاذ اللہ)

یا پھر اس جھگڑے کی بنیاد معاذ اللہ پیغمبر اکرم نے ڈالی تھی کہ اپنے صحابی سے کچھ کہا اور اپنی بیٹی سے کچھ کہا۔؟

یا اللہ! میں تجھے گواہ بنا کے اعلان کرتا ہوں کہ تیرا امین و صادق رسولؐ اس طرح کے فنون سے پاک ہے ناممکن ہے کہ اس نے فاطمہؑ سے کچھ کہا ہو اور ابوبکر سے کچھ کہا ہو۔

میرے مالک! آسیہ گردانی و قرآن سرائی کرنے والی خاتون، جس کی رگوں میں پیغمبرؐ کا خون دوڑ رہا تھا جس کی ماں نے اپنی ساری دولت اسلام پر قربان کر دی تھی جس کے ہاتھوں کے آبلے دنیا کو حقارت سے دیکھتے تھے جسے زبان رسالت "بضعۃ منی"، سیدہ نساء عالم، خاتون جنت، جیسے ناموں سے پکارتی ہو۔ قرآن جس کی طہارت کی گواہی دے رہا ہو جس کے بیٹوں کا ایک ایک قطرہ خون تیرے دین کی بقا کے لئے کام آ گیا ہو۔ ناممکن ہے کہ تیری یہ منتخب کنیز غلط بیانی سے کام لے۔

میرا وجدان میرا یقین میرا اسلام گواہی دے رہا ہے کہ فاطمہ کو جھٹلانے والا بالواسطہ نبیؐ کو جھٹلا رہا تھا۔

یہی خلافت راشدہ کا عہد تھا جس میں مالک ابن نویرہ اور ان کے قبیلے کو حکومت اسلامی کے خطاب یافتہ سیف اللہ نے قتل کر دیا جب کہ اعلان کرتے ہوئے

قتل ہوتے رہے کہ ہم مسلمان ہیں ہم موحد ہیں ہم پیغمبر کے اطاعت گذار ہیں۔ حضرت خالد نے جس دن حضرت مالک کو قتل کیا اسی رات کو ان کی بیوہ سے رشتۂ ازدواج بھی قائم کرلیا ــــ حضرت عمر انہیں زانی اور بے گناہ مسلمانوں کا قاتل سمجھتے رہے۔ مگر حضرت ابوبکر ان کے دونوں عمل کو تاویل کی غلطی کہتے رہے۔

(تاریخ ابن وردی۔ ابن واضح۔ جدید طبری۔ تاریخ ابو الفداء)

یہی خلافت کا زمانہ تھا جب۔ سعد بن عبادہ صحابیٔ رسولؐ کو جنّاتوں نے قتل کر دیا یہی مثالی دور تھا جب خلیفۂ وقت نے مار مار کے حضرت عمّار یاسر کی پسلیاں توڑ دیں یہی زمانہ تھا جب حضرت عبداللہ ابن مسعود کی خلیفۃ المسلمین نے اس طرح پٹائی کی کہ ان کی آنتیں پھٹ گئیں اور ابوذر غفاری کو ان کی کمسن بیٹی کے ساتھ جنگل میں بھنکوا دیا گیا۔ یہی عہد زرّیں تھا کہ جن ہاتھوں نے حضرت عثمان کو خلیفہ بنایا انہیں ہاتھوں نے انہیں قتل کر دیا۔ یہی عہد راشدہ تھا جب امّ المومنین حضرت عائشہ، حضرت علیؑ سے جنگ کرنے کے لئے خانۂ نبوّت سے نکل کے سپہ سالار لشکر بن کے میدان جنگ میں پہونچ گئیں اور یہی عہد تھا کہ جب جنگِ صفّین میں مسلمانوں کا خون پانی سے زیادہ سستا ہو گیا تھا۔

اور یہی خلافت راشدہ کا زمانہ تھا جب اصحاب پیغمبرؐ نے ۱۳ ہزار اصحابِ پیغمبرؐ کو جمل میں اور ستّر ہزار اصحاب پیغمبرؐ کو صفین میں قتل کر دیا۔

مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ حضرت عمر فاروق خلیفۂ ثانی کا عہد اسلامی عدل وانصاف کا نقطۂ عروج تھا۔ اس نقطۂ عروج کا آخری صفحہ کیسا تھا، یہ مصر کے مشہور دانشور ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی عبارت کے اس خلاصے میں نظر آتا ہے۔

"حضرت عمر نماز پڑھانے جا رہے تھے کہ ابو لؤلو نے دو شاخہ خنجر گھونپ دیا۔ لوگوں نے اسے گھیر لیا، لیکن قبل اس کے کہ سوال، جواب ہوتا اس نے خودکشی کر لی۔ حضرت عبیداللہ ابنِ عمر برہنہ تلوار لہراتے ہوئے نکلے۔ کسی نے انھیں اطلاع دیدی کہ ایک دن پہلے ابو لؤلو کو ہرمزان سے بات کرتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ انھوں نے غصے میں ہرمزان کو قتل کر دیا جب اسے تلوار لگی تو مرنے سے پہلے اس نے لَاۤ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کہا، پھر وہ ابو لؤلو کے گھر میں گھس گئے اور جفینہ اور ابو لؤلو کی لڑکی کو موت کے گھاٹ اتار دیا نہ جانے اور کتنے قتل ہوتے مگر سعد ابنِ وقاص نے انھیں پکڑ لیا اور اس وقت تک نہ چھوڑا جب تک تلوار ان (شہزادے) کے ہاتھ سے نہ چھوٹ گئی۔

حضرت علیؑ اور دوسرے بزرگوں کا کہنا تھا کہ عبیداللہ ابنِ عمر تین بے گناہوں کے قاتل ہیں، قصاص ضروری ہے۔ حضرتِ عثمان قریش کی ناراضگی کے خوف سے قصاص پر راضی نہ ہوئے،

اور بحیثیت عثمان، تینوں مقتولین کا "خوں بہا" دے کے بحیثیت خلیفۃ المسلمین واپس لے لیا۔

حضرت علیؑ کے عہدِ خلافت میں عبید اللہ بن عمر قصاص کے خوف سے شام بھاگ گئے اور جنگِ صفین میں معاویہ کے لشکر میں شامل ہو کے حضرت علیؑ سے مقابلہ کیا"۔

(فتنۃ الکبریٰ ترجمہ پروفیسر محمد منوّر، صفحہ ۶۸، لاہور)

الغرض میرا منطقی شعور اس "عہد مقدس" کو دوسری قوموں کے سامنے مثالیہ بنا کے پیش کرنے پر راضی نہیں۔ میری غیرتِ اسلامی گوارہ نہیں کرتی کہ اس بے مہار عہد کو عدلِ اسلامی کا نمونہ بنا کے دنیا کے سامنے پیش کروں۔ ـــــ اور میرا جذبۂ بت شکنی اس پر بھی تیار نہیں ہے کہ اس عہد کو احترام و تعظیم کے ریشمی غلاف میں لپیٹ کے صبح و شام اس پر عقیدت کے پھول چڑھاتا رہوں۔ اسلیئے:-

مولانا مودودی مرحوم کے مشہور شاگرد اور شریک کار مولانا نعیم صدیقی کی کتاب "معرکۂ دین و سیاست" سے ایک اقتباس پر اس باب کو بند کرتا ہوں۔

"کتنا بڑا سانحہ تھا کہ عین وہی ملّت یا جماعت جو دنیا سے مطلق العنان اقتدار اور شخصی و موروثی حکومت کا سلسلہ ختم کرنے اٹھی تھی چند ہی قدم چلنے کے بعد لڑکھڑا کے گری تو ایسی

گری کہ مطلق العنان اقتدار اس کے کاندھوں پر سوار ہو گیا۔
اور اس نے جبر و استبداد کے کوڑوں کے بل پر صدیوں تک
اسے الٹی سمت دوڑایا۔ (معرکۂ دین و سیاست صفحہ ۳۳)

"تاریخ کے دھارے کا رُخ ذرا سا جو بدلا تو پھر گھماؤ بڑھتا ہی چلا گیا۔ موروثی شخصی سلطنت کو خلافت کا نام دینے کے باوجود یہ ناگزیر تھا کہ اس درخت سے یزید، ابن ہبیرہ، مروان، ہشام جیسی شاخیں پھوٹیں اور وہ کربلا، حرّہ اور قتلِ سادات جیسے برگ و بار لائیں ـــــ پھر یہ بھی ناگزیر تھا کہ اس درخت کی چھاؤں میں ابھوا پرستانہ ثقافت کی مجلسیں آراستہ ہوں جس میں شرابِ عشرت کے دور چلیں اور مغنیانِ آتش نوا متاعِ ہوش کے رہزن بنیں۔ درآنحالیکہ ادھر ممتاز داعیانِ حق ذبح ہو رہے ہوں اور مسلم عوام کے لاشے تڑپ رہے ہوں۔"

معرکۂ دین و سیاست صفحہ (۳۴)

میں دیکھتا ہوں کہ :۔
کبھی اجماع، کبھی وصیت، کبھی شوریٰ، کبھی تحکیم، کبھی غلبہ کبھی وراثت؛
۔۔۔ خلافت سازی کا نہ کوئی اصول ہے نہ ضابطہ، نہ کوئی قانون ہے نہ قاعدہ؛
جو کچھ ہو جائے وہی صحیح جو نہ ہو وہ غلط ۔۔۔ جو کچھ ہو گیا اس کے خلاف
آواز بلند کرنا بغاوت، اور جو نہیں ہوا اس کی صداقت کا اعلان کفر و ارتداد۔
میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر پیغمبرؐ اسلام نے، خلافت کی تشکیل و تنصیب
کے لئے کوئی ہدایت کیوں نہیں دی، اللہ نے "ختمِ نبوت" کے بعد کے لئے آسمانی
ہدایت کا متبادل ہدایت کا قانون کیوں نہیں بتایا۔؟
پیغمبرؐ اتنے بڑے منصب کو جو رسالت کے چھوڑے ہوئے کاموں کی
تکمیل کا ذمہ دار ہے، اور نیابتِ پیغمبرؐ کا دعویدار ہے، اسلام کے عادلانہ
معاشرے کی تکمیل کا ذریعہ ہے ۔۔۔ اتفاقات و حوادث کے حوالے کیوں
کر گئے۔؟ ۔۔۔ کیا اللہ یہی چاہتا تھا کہ یہ امت چند برسوں کے اندر پھر انھیں
انحرافات کا شکار ہو جائے اور جاہلیت کے اسی اندھیرے میں گر جائے جس سے
پیغمبر اکرمؐ نے نکالا تھا۔
میرے سامنے یہ ایک بہت واضح اور فطری سوال ہے۔ ۔۔۔
جس کے دو ہی جوابات ہیں، یا تو نبیؐ آخر نے امت کو اسی راستے پر چلایا تھا
جس پر وہ گامزن ہے ۔۔۔ ہلاکت خیز اور وحشت ناک راستہ ظلم و جور،
تشدد و تعدی کا راستہ، انسانیت کی تباہی کا راستہ، ۔۔۔ جو عدل و انصاف

اور اسلامی کردار و اخلاق کو مقتل اور خود اولادِ نبی کو قتل گاہ میں پہونچا دے ـــــ مسلمان ظلم و جور سے نہ خود بچ سکیں نہ دوسروں کو بچا سکیں۔ دنیا مسلمانوں کا مذاق اڑاتی رہے، نئے نئے نظریات اسلام کا منھ چڑھاتے رہیں ہلاکت خیزیوں کے لئے نئے نئے خنجر ایجاد ہوتے رہیں۔ عدل و انصاف سے محروم انسانیت، سرمایہ داری جمہوریت اور اشتراکیت کی ڈگڈگی پر ناچتی رہے ـــــ قرآن فریاد کرتا رہے، قوانین اسلام بے وطن رہیں اور اسی عالم میں یہ دنیا ختم ہو جائے۔

یا پھر اللہ و پیغمبرؐ نے امت کے لئے کسی دوسرے راستے کا تعیّن کیا تھا ـــــ اور وہی خیر و فلاح کا راستہ تھا۔ اگر امت اس راستے پر چلتی تو قرآن کے وعدے کے مطابق زمین و آسمان کی نعمتوں کے دروازے کھلے ہوتے اور عدل اجتماعی کی آغوش میں پوری دنیائے انسانیّت امن و سکون کے راستے پر محوِ سفر ہوتی۔

مگر امت نے اللہ و نبیؐ کی مرضی کے خلاف اپنے لئے یہ ہلاکت خیز راستہ خود ایجاد کر لیا ہے۔

میں یہ تسلیم نہیں کر سکتا اور میری عقل ایک لمحہ کے لئے یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے کہ ـــــ اسلام بھی دنیا کے تشکیل دیئے ہوئے نظریات کی طرح اور انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی طرح انسانیت کے لئے مکمل عدل

وانصاف کا سماج نہیں دے سکتا۔ اور نسلِ انسانی کو آلام ومصائب کے اندھیرے سے نہیں نکال سکتا۔ اس میں بھی اتنی صلاحیت نہیں ہے کہ دنیا سے ظلم وجور کا خاتمہ کردے ـــــ اس لئے کہ یہ رب العالمین کا بنایا ہوا نظام ہے جو رحمٰن ورحیم بھی ہے اور عادل وحکیم بھی۔

★ اس نے پوری کائنات کو حق اور عدل پر قائم کیا ہے۔ (احقاف ۳)

"کیوں"؟

کیوں کا سوالیہ نشان ہر علم کی بنیاد ہے۔ اگر کیوں نہیں تو کچھ نہیں۔ دنیا کی تمام علمی اور سائنسی ترقیاں اسی کیوں کی رہینِ منت ہیں۔۔۔ اگر نیوٹن کے ذہن میں سوالیہ نشان نہ پیدا ہوتا کہ "شاخ سے ٹوٹنے والا دانہ سیب زمین پر کیوں گرا؟" تو کششِ ارضی کا علم بھی نہ حاصل ہوتا۔ سوال اٹھانا اور اس کا صحیح جواب تلاش کر کے اس پر عمل پیرا ہونا ہی انسانیت کا طرۂ امتیاز ہے۔ بلا سوچے سمجھے اور عقل کی کسوٹی پر پرکھے ہوئے نہ کسی عمل کا کوئی اعتبار ہے نہ عقیدہ کا۔ لہٰذا ہمیں کچھ ماننے سے پہلے یہ طے کر لینا چاہیئے کہ ہم یہ کیوں مانتے ہیں اور کچھ کرنے سے پہلے یہ فیصلہ کر لینا چاہیئے کہ یہ کیوں کرتے ہیں؟۔

اسلام نہ موروثی عقیدے کا قائل ہے نہ سماج کی تقلید میں انجام پانے والے عمل کا روادار ہے۔ عقیدہ وہی سچّا ہے جس کی بنیاد عقل و منطق پر ہو اور عمل وہی صحیح ہے جس کا حکم قرآن و حدیث نے دیا ہو۔ دلائل براہین جس کے ساتھ ہوں۔

باپ دادا کے ورثے میں ملا ہوا عقیدہ یا سماج یا معاشرے کی تقلید میں کئے ہوئے عمل کو نہ عقل صحیح تسلیم کرنے کے لئے تیار ہے نہ قرآن حکیم۔

کچھ ماننے سے پہلے ہمیں اپنی عقل اور اپنی فکر سے سوال کرنا چاہیئے کہ ہم مان لیں تو کیوں مان لیں۔؟

اگر ہم اس لئے مانتے ہیں کہ ـــــ

۱۔ ہمارے باپ دادا مانتے تھے۔

۲۔ ہمارا معاشرہ یہی مانتا ہے۔

۳۔ فلاں پیر دستگیر نے مکاشفات کے ذریعہ اس عقیدہ کا پتہ لگایا ہے۔

۴۔ فلاں بزرگ نے خواب میں معلوم کیا ہے۔

۵۔ ارسطو، بقراط اور افلاطون جیسے فلسفیوں نے بتایا ہے۔

تو یہ تمام جوابات عقل و منطق کی دنیا میں مہمل اور غلط، قرآن کی نگاہ میں ناقابلِ قبول اور لائقِ تعزیر ہیں۔ صحیح جواب صرف اور صرف یہ ہے کہ ہم اس لئے مانتے ہیں کہ:

عقل و منطق کی روشنی میں یہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

قرآن نے یہی بتایا ہے اور پیغمبرؐ نے اس کی خبر دی ہے۔

نیا فارمولہ

چلئے! اگر میں یہ فرض بھی کر لوں، کہ خلافتِ راشدہ کا عہد مثالی عہد تھا، عدل و انصاف سے بھرا ہوا زمانہ تھا۔ نبوت کے راستے پر چل رہا تھا۔

__ تو سوال یہ ہے کہ، صرف ۳۰ سال؟ __ ہزاروں سال کی انسانی تاریخ میں ۳۰ سال کا وقفہ پلک جھپکنے سے بھی کم ہے __ پیغمبروں کی قربانیوں کا حاصل صرف ۳۰ سال __؟

۳۰ سال بعد وہ قرآنی سماج کیوں مر گیا۔ صرف ۳۰ سال میں اس عادلانہ نظام کی سانس کیوں ٹوٹ گئی __؟

میرا منطقی شعور فیصلہ کرتا ہے کہ صرف دو ہی صورتیں ہیں۔

یا تو نبیِ آخر کا قائم کیا ہوا نظام اتنا ہی کمزور تھا کہ ۳۰ سال سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اللہ کے بنائے ہوئے قرآنی معاشرے میں ۳۰ سال سے زیادہ زندہ رہنے کی صلاحیت نہیں تھی۔

اور اگر ایسا نہیں ہے __ اور یقیناً ایسا نہیں ہے کیوں کہ قرآن بار بار پیغمبرؐ کے قائم کئے ہوئے نظام کے ابدی ہونے کا اعلان کر رہا ہے۔

تو پھر دوسری صورت یہی ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کے بعد اس نظام کی قیادت کرنے والے اناڑی تھے __ اور زبردستی اسکے سر پر سوار ہو گئے تھے۔

مثلاً اگر کسی کمپنی سے نکلی ہوئی نئی کار ۳۰ میل کا فاصلہ طے کر کے فیل ہو جائے تو معمولی عقل والا بچہ بھی یہی کہے گا کہ ـــــ یا تو کمپنی نے کار ہی ایسی خراب بنائی تھی جو بہ مشکل ۳۰ میل چل کے بیکار ہو جائے ـ یا تو اس کے چلانے والوں نے "سوئے استعمال" سے اسے ناقابلِ استعمال بنا دیا ـ

میں تاریخِ انحراف کے کسی خاص عہد کو نقطۂ انحراف نہیں مان سکتا اس لئے کہ صالح عہد کے بطن سے فاسد عہد نہیں پیدا ہو سکتا ـ

مجھے یقین ہے کہ انحراف اسی وقت شروع ہو گیا جب پیغمبرؐ دنیا سے رخصت ہوئے اور نقطۂ انحراف وہی لمحہ ہے، جب اللہ کے نبیؐ نے زمین پر آخری سانس لی ہے ـ

اس نظام کا تعلق نہ قرآن سے تھا نہ سیرتِ پیغمبرؐ سے بلکہ یہ بالکل نیا فارمولہ تھا ـ جس کے بارے میں مصری عالم ڈاکٹر طہٰ حسین نے لکھا ہے کہ :-

> "حضرتِ ابو بکر اور حضرتِ عمر کا یہ ایک بہت بڑا جراٴت مندانہ تجربہ تھا، جو تقریباً جان کی بازی لگا دینے کے مترادف تھا ـ
> لیکن یہ جان آزما مہم اپنے انجام تک نہ پہونچی نہ ہی اس کا انجام تک پہونچنا ممکن تھا ـ (الفتنۃ الکبریٰ، مترجم محمد منور صفحہ ۳)

ظاہر ہے کہ اس تجربہ کا تعلق پیغمبرؐ کے قائم کئے نظام سے نہیں ہو سکتا ـ کیونکہ

☆ وَمَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ☆ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ☆

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحیٰ ٭ (سورۂ نجم)

(تمہارا رفیق نہ بے راہ ہوا نہ بہکا، اور نہ وہ اپنی خواہش سے کچھ کہتا ہے۔ یہ نازل کی جانے والی وحی کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔)

اور اللہ کو کسی تجربے کی ضرورت نہیں کہ جس کی ناکامی کا سوال پیدا ہو — یہ تجربہ نہیں نفاذ تھا — جسے پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی عرب جاہلیّت اور قریش استقراطیّت نے اچک لیا۔ ...

تہتّر فرقے مگر ایک اسلام

مجھے اطلاع ملتی ہے کہ مسلمان تہتّر فرقوں میں بٹ چکے ہیں۔ لوگ پوچھتے ہیں تم کس فرقے میں شامل ہو۔ مسلمانوں میں تہتّر فرقے ہیں۔ کون سا فرقہ صحیح ہے؟

میں کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ مجھے نہیں معلوم کہ کون سا فرقہ صراطِ مستقیم پر گامزن ہے اور کون سا گروہ انحراف کا شکار ہے؟ میں کس گروہ کے ساتھ اپنی زندگی گزاروں؟ کس ٹولی میں شامل ہو جاؤں؟

اب میں ان فرقوں کا جائزہ لیتا ہوں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے طرزِ حیات کا مشاہدہ کرتا ہوں، ایک ایک سے پوچھتا ہوں کہ تمہارا نقطۂ نظر کیا ہے؟ تمہارا نظامِ عمل کون سا ہے؟

میں نے دیکھا۔۔۔ غور کیا۔۔۔ اور فیصلہ کرنا پڑا۔۔۔

زمین کے اِس سرے سے اُس سرے تک سارے مسلمانوں کا دین ایک ہے۔

سب خدائے وحدہٗ لاشریک کا کلمہ پڑھتے ہیں۔

سب محمد مصطفیؐ کی رسالت کی گواہی دیتے ہیں۔

سب ایک لاکھ چوبیس ہزار نبیوں کی بعثت کے قائل ہیں۔

سب کہتے ہیں کہ ہمارے نبیؐ کے بعد اب کوئی نبیؐ آنے والا نہیں۔
سب کہتے ہیں کہ اللہ نے ہدایت کے لئے چار کتابیں اور صحیفے نازل فرمائے ہیں۔
سب کہتے ہیں کہ آخری کتاب قرآن ہے اس کے بعد کوئی کتاب آنے والی نہیں۔
سب کے ہاتھ میں قرآن ہے جسے سب اپنے لئے حجّت مانتے ہیں۔
سب کہتے ہیں قرآن کی اطاعت واجب ہے۔
سب کہتے ہیں قیامت آنے والی ہے۔ جہاں عمل کے ذرّے ذرّے کا حساب ہوگا۔
سب کہتے ہیں نیک اعمال کی جزا جنّت، بُرے اعمال کی سزا جہنّم۔
سب ملائک، حور، غلمان کے وجود کے قائل ہیں۔
سب نماز پڑھتے ہیں۔
سب رمضان میں روزہ رکھتے ہیں۔
سب ایک ہی طرح حج کرتے ہیں۔
سب زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ کبھی چالیسواں، کبھی بیسواں، کبھی دسواں، کبھی پانچواں۔ یہ مقداریں الگ الگ اوقات اور آمدنی کی الگ ماہیت پر عائد ہوتی ہیں۔
سب جہاد یعنی اللہ کے دین کے قیام کی کوشش کو واجب جانتے ہیں۔

سب کے یہاں چوری، ڈاکہ، جوا، شراب، غصب، جھوٹ، دھوکہ، بغیر ذبیحے کا گوشت حرام ہے۔

سب پیشاب، پاخانے، منی، کتّے، سور کو نجس سمجھتے ہیں۔

سب بغیر نکاح ازدواج کو حرام کہتے ہیں۔

سب عقد کے ساتھ مہر ادا کرتے ہیں۔

سب کے یہاں عدے کے بغیر عورت دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔

سب کے یہاں شوہر اور زوجہ کے حقوق ایک ہیں۔

سب کے یہاں قانونِ وراثت ایک ہے۔

سب کے یہاں ختنہ ضروری ہے۔

سب جب پیدا ہوتے ہیں تو کان میں اذان واقامت کہی جاتی ہے اور مرتے ہیں تو سب غسل وکفن اور نمازِ میّت کے بعد دفن کر دیئے جاتے ہیں۔

میں نے دو بار حج کی سعادت حاصل کی مدینے میں بھی رہا اور مکّے میں بھی لاکھوں فرزندانِ توحید کے درمیان اور لاکھوں برادرانِ اسلام کے ساتھ نمازیں بھی پڑھیں طواف بھی کیے سعی بھی کی احرام بھی باندھا۔ عرفات میں دن گذرا۔ مزدلفہ میں رات گذری۔ منیٰ میں قیام کیا۔ مگر مجھے کوئی ایسا فیتہ نہیں ملا جس سے ناپ ناپ کے تمام فرقوں کو الگ کر دوں۔

پوری زندگی میں صرف دو مرتبہ میرے سامنے سوالیہ نشان پیدا ہوا۔

کہ کس کا ساتھ دوں ؟

۱۔ جب نماز سے پہلے وضو کرتے ہیں تو کچھ پاؤں دھوتے ہیں اور کچھ لوگ پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔

۲۔ جب نماز پڑھتے ہیں تو کچھ لوگ قیام میں سینے یا پیٹ پر ہاتھ باندھ لیتے ہیں اور کچھ لوگ سیدھے فطری طریقے سے صرف قیام کرتے ہیں۔

مجھے یقین ہے کہ اتنے بڑے اور ہمہ گیر نظامِ حیات میں زندگی گذارنے والوں کے درمیان اگر اتنا سا جزوی فرق ہو جائے تو نہ مذہب بدل جائے گا نہ دین۔

میں نے سوچا اور غور کیا کہ ان دونوں مسئلوں میں، میں کون سا راستہ اختیار کروں ؟ نہ میں محدّث ہوں نہ میرے پاس اتنا وقت ہے کہ سچّی اور جھوٹی حدیثوں کے بحرِ ذخار کو عبور کر کے حقیقتِ حال تک پہنچوں۔ نہ میرے پاس اتنی طاقت ہے کہ "لغت ہائے حجازی" کا کوہ بے ستون، توڑ کے چشمہ حقیقت کا پتہ لگاؤں۔

مگر مجھے کوئی پریشانی نہیں اس لئے کہ میرے پاس وہ نور ہے، وہ فرقان، وہ برہان وہ بیّنہ ہے جو میرا نبیؐ مجھے دے گیا ہے۔ جو ایسا ہمسر ہے جو کہیں ساتھ نہیں چھوڑتا۔ جو ایسا رہنما ہے جو کبھی گمراہ نہیں کرتا۔

میں نے قرآن سے پوچھا کہ اگر ہمارے درمیان میں کوئی اختلاف ہو جائے تو کیا کروں۔ اس نے واضح جواب دیا۔

اگر تمہارے درمیان کسی بات پر نزع ہو تو اللہ و رسولؐ کی طرف رجوع کرو۔ (النساء ۸)

میں نے قرآن سے وضو کا طریقہ پوچھا اس نے کھلا ہوا جواب دو فقروں میں دے دیا۔

(فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ) دھو ڈالو! اپنے چہروں کو اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں تک (۵)

وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَيْنِ مسح کرو! اپنے سروں کا، اور اپنے پیروں کا، ٹخنوں تک۔ (مائدہ۔ ۵)

مجھے بال کی کھال کھینچنا نہیں آتا۔ اسلام سیدھا سادہ فطری مذہب ہے۔ اور قرآن اس لئے نازل نہیں ہوا ہے کہ لوگ قیامت تک تفسیر کے نشتر سے اس کے بال کی کھال کھینچتے رہیں۔ اللہ کی کتاب صاف صاف، آسان اور واضح گفتگو کرنے کی دعویدار ہے اس نے سیدھے سیدھے حکم دیا ہے سروں اور اپنے پیروں کو ملو۔ آدمیوں کے بنائے ہوئے صرف و نحو کے قاعدوں اور زبان و بیان کے اصولوں کو قرآن کے آگے آگے نہیں پیچھے پیچھے چلنا ہوگا۔ یہ معجزانہ کلام انسانوں کے بنائے ہوئے قاعدوں سے بہت بلند ہے۔

پاؤں دھونے والے اور پیروں پر مسح کرنے والے دونوں اپنے اپنے طریقۂ عمل کے سلسلے کو سنّتِ پیغمبرؐ سے جوڑتے ہیں۔ دونوں کے پاس

حدیثوں اور روایتوں کا ذخیرہ ہے دونوں کے پاس گواہیاں ہیں اور دونوں کی پشت پر مجتہدین کا گروہ ہے۔

مگر میں قرآن کے حکم کے مطابق پیروں پر مسح کرتا ہوں۔ مجھے بارگاہِ الٰہی میں بری الذمہ ہونے کا یقین حاصل ہے۔

اسی طرح میں نے بار بار قرآن کی تلاوت کی۔ بار بار قرآن سے پوچھا مگر اس نے قیام کا حکم تو دیا ہے مگر ہاتھ باندھنے کا حکم کبھی نہیں دیا۔ لہٰذا میں ہاتھ نہیں باندھتا۔

میرا دل کہتا ہے کہ مالکِ حقیقی، ہاتھ باندھنے اور نہ باندھنے۔ یا پاؤں دھونے یا نہ دھونے کی بنیاد پر کسی کو جہنم میں نہیں ڈھکیل دے گا۔ البتہ نبیؐ کا طریقہ معلوم ہو جانے کے بعد اس کا انکار مسلمان کو بھی کافر بنا دیتا ہے۔

میرا نام اللہ نے مسلمان رکھا ہے۔ کسی فرقے کے گھروندے میں بند ہونے کے بجائے سارے مسلمانوں کے ساتھ خود کو محسوس کرتا ہوں۔ سب میرے بھائی ہیں۔ سب ایک ہی کنگھے کے دندانے ہیں۔ سب ایک ہی باپ کے بیٹے ہیں۔ لائق ہوں یا نالائق۔ سب اسی مکیؐ مدنیؐ سے منسوب ہیں۔ اور یہی نسبت اس ہولناک دنیا میں ہم سب کا سہارا ہے۔

سب مسلمان ہیں تہتّر نہیں تہتّر ہزار فرقے ہو جائیں مگر اسلام ایک تھا، ایک ہے اور ایک رہے گا مگر تاریخ مجھ سے ایک سوال ضرور کرتی ہے۔

اسلام آج بھی اپنے پورے وجود کے ساتھ زندہ بھی ہے اور تابندہ بھی۔ جب محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا سے رخصت ہوئے تھے تو دو۲ چیزیں چھوڑی تھیں۔ اسلام اور اسلامی حکومت۔

اسلام ہمیں مل گیا۔ مگر اسلامی حکومت کہاں کھو گئی؟

اسلامی نظام کا گلا کیسے گھونٹ دیا؟

اسلام کیسے بچ گیا اور چودہ صدیوں کا سفر کر کے ہم تک پہونچ گیا۔

(ان کے جواب کی تفصیل "اسلام ہی کیوں" کے حصۂ دوئم میں دیکھئے۔)

پیام اعظمی
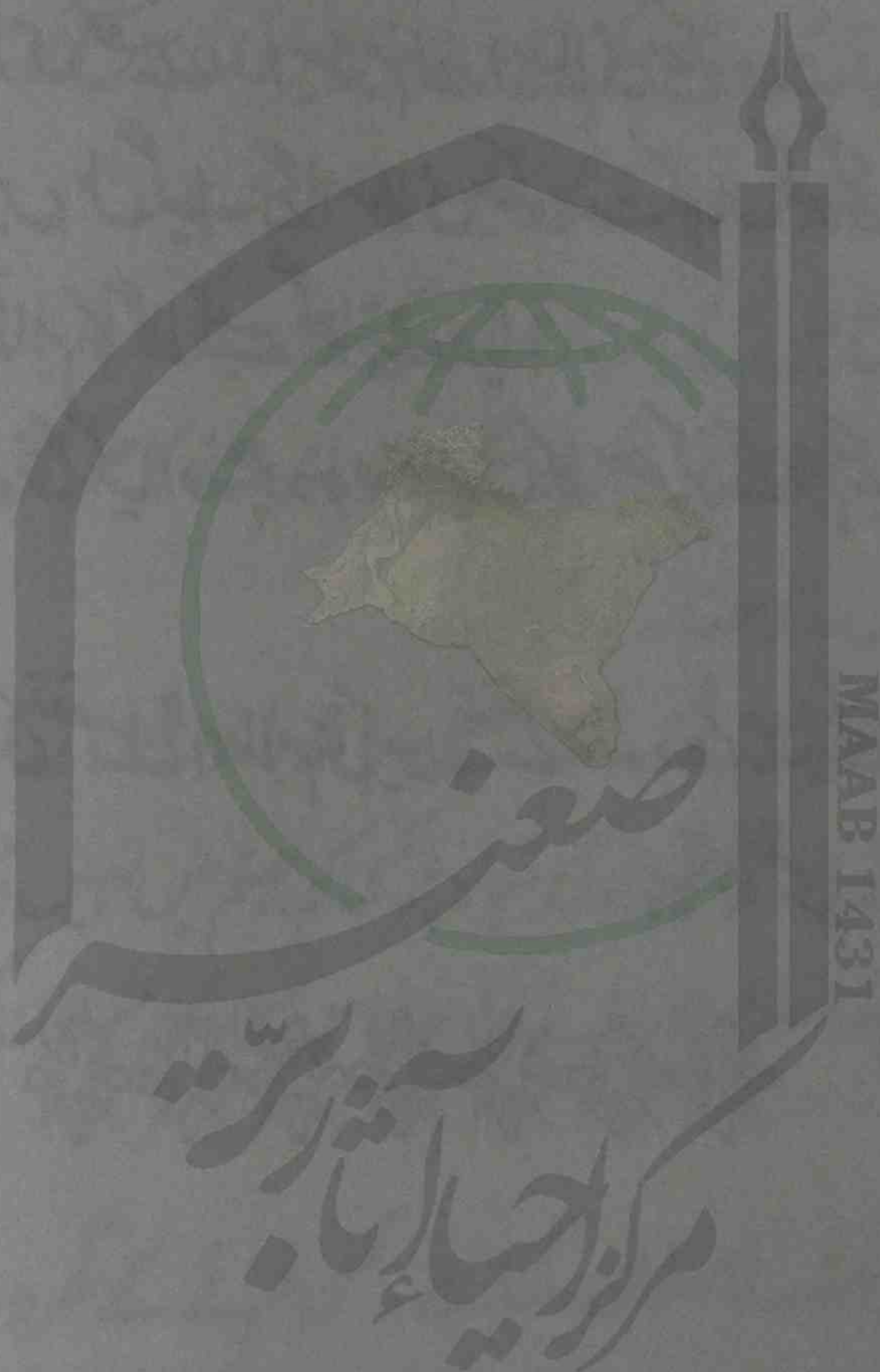
عادلانہ معاشرہ

میں سوچتا ہوں ___ غور کرتا ہوں، اور پورے یقین کے ساتھ یہ فیصلہ کرتا ہوں کہ انسان جو معاشرت پسند وجود کا مالک ہے۔ اسے پُرامن اور پُرسکون زندگی گذارنے کے لئے ایک معاشرہ چاہیے جو اسکی شخصیّت کی تعمیر و تکمیل کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے کے بجائے اس کا معاون و مددگار ہو۔ جس معاشرے میں وہ اپنی صلاحیتوں کو پورے اطمینان کے ساتھ بروئے کار لاسکے۔ جہاں ہر شخص کو برابر سے اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو خرچ کرنے کے مواقع حاصل ہوں۔ جہاں کا ہر فرد پیداوار میں برابر کا حصّہ دار ہو۔ جو آج معاشروں کی طرح ایک طویل اور عریض قمار خانہ نہ ہو کہ ہر نتیجہ یقینی ہونے کے بجائے اتفاقی ہو۔ حالات کے غیر یقینی جھٹکے کسی کو دولت مند بنادیں اور کسی کو فقیر۔ کسی کو مسندِ شرافت پر بٹھادیں اور کسی کو ذلّت کی نالیوں میں ڈھکیل دیں۔

جہاں یہ نہ ہوسکے کہ ایک شخص اپنی ایک گھنٹہ کی محنت کی قیمت اتنی وصول کرے جتنی دوسرا شخص مہینوں کی محنت کے بدلے میں بھی نہ حاصل کرسکے۔

وہ معاشرہ آج کے معاشروں کی طرح کسی راشن کی دوکان پر لگی

ہوئی بھیڑ نہ بن جائے کہ ہر آدمی ایک دوسرے کو دھکّا دے کر آگے بڑھ جانے کی کوشش میں لگا ہو۔ جہاں نہ مصنوعی ضرورتیں پیدا کی جائیں نہ مصنوعی قیمتیں معیّن کی جائیں کہ اسٹیج کے مسخرے اپنی اُچھل کود کے ذریعے ایک سنجیدہ مفکّر کی قلمی کاوشوں سے زیادہ پیداوار میں حصّہ بٹا لیں ــــ جہاں ایسا نہ ہو کہ اللہ کے کمزور بندے دو گز جگہ سے بھی محروم رہ جائیں اور سیاسی بہروپئے اللہ کی زمین کے مالک بن جائیں۔

جہاں تعلیم کے دروازے سب کے لئے برابر سے کھلے ہوں۔ جہاں رزق کے سرچشمے سب کے لئے برابر سے جاری ہوں، جس کا ہر ممبر اپنی جگہ مطمئن ہو کہ ہمارا حق ہر حال میں محفوظ رہے گا ــــ جہاں اگر کسی کی جھولی میں مقدار سے زیادہ پہونچ جائے تو وہ معذرت کے ساتھ واپس کر دے ــــ اور اگر کسی کے دامن میں پہونچنے والی مقدار کم ہو جائے تو پورے سماج کے ضمیر کو شرمندہ کر دے۔

ایک ایسا معاشرہ جو رنگ اور نسل، خون اور مٹی کے بجائے عقیدے کی بنیاد پر قائم ہو اور مختلف صلاحیتوں کے لوگوں کو ایک ہی رشتۂ عدل میں پرو کے ایک ایسا گلدستہ بنا دے کہ ایک ہی خوشبو نکلے اور ایک ہی رنگ دکھائی دے ــــ جہاں تنوّع کا حسن ہو مگر طبقوں کی ناہمواری نہ ہو۔ جہاں صلاحیتوں کا فرق ایک دوسرے کے لئے کشش کا سبب بن جائے، کشمکش کا ذریعہ نہ بننے پائے ــــ نہ کوئی امیر ہو نہ غریب، نہ منعم ہو نہ

محروم۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا ــــــ؟ جی ہاں! غربت اور امارت کی سرحدیں کبھی نہیں ٹوٹ سکتیں، اور اقتصادی ناہمواری کی دیوار کبھی نہیں گرائی جا سکتی ــــــ کیا یہ تقدیرِ الٰہی ہے ــــ؟

نہیں، اگر یہ صحیح ہے تو ایک پُرسکون اور پُرامن معاشرہ کبھی عالمِ وجود میں نہیں آسکتا۔ اس لئے کہ اقتصادی ناہمواری ایسا دو دھاری خنجر ہے جو دونوں طرف سے انسانیت کا گلا کاٹتا ہے، ایک سانپ ہے جس کے "دو پھن" ہیں اور وہ دونوں طرف سے انسانیت کو ڈستا رہتا ہے۔ اگر یہ دیوار نہیں گرائی جا سکتی تو ــــ امارت فرعون و شدّاد پیدا کرتی رہے گی اور غربت آدمی کو "حشرات الارض" بناتی رہے گی ــــ بس تاریخ کے مزاج کے لحاظ سے ان کی شکلیں بدلی ہوئی ہونگی۔ استکبار آدمی کو درندہ بناتا رہے گا اور احساسِ محرومی انسانیت کی رگوں میں زہر بھرتا رہے گا۔ امارت انسانیت کو پھاڑ کھاتی ہے اور غربت ڈس لیتی ہے ــــ شرافتِ آدم بھری ہوئی تجوری اور خالی پیٹ کی چکّی میں دم توڑ دیتی ہے۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ غربت اور امارت کی دیوار گرائے بغیر ایک عادلانہ اور پُرامن معاشرہ کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔؟ نہ تاریخ کے طویل تجربات اسے ماننے کے لئے تیار ہیں۔ نہ عقل کسی ایسے معاشرے کا تصوّر کر سکتی ہے۔

سب سے بڑا ظلم جو انسان نے انسان پر ڈھایا ہے، وہ اقتصادی ناہمواری

ہے۔ تمام سماجی بُرائیاں اسی ایک برائی کی کوکھ سے جنم لیتی ہیں۔ شرک، کفر، استکبار، استضعاف، چوری، ڈاکہ، خوف، تصنّع، جھوٹ، نفاق اور دہشت گردی، سب اسی عفریت کی اولاد ہیں۔

کائنات کا عادلانہ نظام گواہی دے رہا ہے کہ اقتصادی ”نابرابری“ الٰہی نظام نہیں ہے۔ انسانی انحراف ہے۔ اسے نظامِ قدرت کہنا اسی وقت ممکن ہے جب ہم یہ تسلیم کرلیں کہ افراد کی تعداد زیادہ ہے اور ”رزق“ کی مقدار کم ہے اس لئے ضروری ہے کہ کچھ لوگ اگر پیٹ بھر کھائیں تو کچھ لوگ فاقہ بھی کریں ـــــ مگر عدمِ توازن کا یہ نظریہ ہمیں مجبور کردے گا کہ ہم کہیں کہ افراد کا خالق کوئی اور ہے اور رزق کا پیدا کرنے والا کوئی اور ـــــ لیکن اگر خدائے رحمٰن و رحیم و عادل و حکیم، بندوں کا خالق بھی ہے اور رازق بھی۔ کیسے ممکن ہے کہ افراد کی تعداد زیادہ ہوجائے اور رزق کی مقدار کم ـ جبکہ خالقِ زندگی بھی وہی ہے اور رازقِ زندگی بھی وہی۔

میری سمجھ میں ایک ہی بات آتی ہے کہ ذرائع پیداوار تک اگر سب کی رسائی برابر سے ہو تو نہ کوئی مستکبر بنے گا نہ مستضعف ـــــ لیکن اگر کچھ لوگ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کرکے دوسروں کے لئے رُکاوٹ کھڑی کردیں گے تو یقیناً دوسروں کو اپنا دستِ نگر بنالیں گے۔

یہ کہنا کہ اللہ نے صلاحیتوں میں فرق پیدا کیا ہے لہٰذا رزق کی تقسیم میں بھی فرق ہونا چاہیئے، ـــــ غیر منطقی بات ہے۔ زمین کا مالک اللہ ہے اور

انسانیت زمین پر اللہ کی خلیفہ ہے۔ اور انسانیت میں ہر انسان ایک دوسرے کے مقابلے میں برابر کا شریک ہے۔ کسی کو کسی پر کوئی ترجیح یا سبقت حاصل نہیں ــــ دوسرے لفظوں میں، ہر آدمی زمین کا فرزند ہے۔ اس لئے زمین پر زندگی گذارنے کا برابر سے حقدار ہے ــــ جب حق زندگی برابر ہے تو زندگی کی قیمت بھی برابر ہوگی اور زندگی کے اوقات کی قیمت بھی برابر ہوگی ــــ صلاحیتوں کا اختلاف تنوّع ہے نہ کہ تفریق، ضرورت ہے نہ کہ مصیبت ــــ تاکہ سب ایک دوسرے سے کام لیں ایک دوسرے کے کام آئیں اور سب اپنی اپنی صلاحیتوں کے مجموعہ سے تعمیر حیات کا کام لیں۔

سب ایک دوسرے کی ضرورت بھی ہوں اور ضرورت مند بھی۔

اس لئے زیدؔ کے ایک گھنٹہ کی قیمت بکرؔ کے ایک گھنٹہ کی قیمت سے کم کیوں ہے۔؟

یہ بات ضرور چونکاتی ہے کہ مشین کا ایک پرزہ بنانے والا انجینیر اور سڑک پر جھاڑو دینے والا مزدور ــــ دونوں کی محنت کی قیمت ایک ہو؟ــــ اگر ایسا نہیں ہے تو دونوں کی محنتوں کی قیمتوں کو طے کرنے کا پیمانہ کیا ہے؟ــــ انجینیر نے مشین کا ایک پرزہ بنایا اور مزدور محلّے کی صفائی عالم وجود میں لایا ــــ پرزے کی قیمت زیادہ ہے یا صفائی کی قیمت؟ یہ کون بتائے۔؟

فنّی مہارت بھی پیداوار کا ذریعہ ہے۔ اور جسمانی طاقت بھی پیداوار کا ذریعہ ہے ــــ اگر فنّی مہارت کے سرچشموں پر چند لوگ قبضہ کرلیں گے

تو بازار میں جسمانی طاقت کی بہتات اور فنی مہارت کی کمی استعمار واستحصال کے راستے کھول دے گی ___ مزدوروں کی تعداد ضرورت سے زیادہ بڑھ جائے گی تو ان کی قیمت گھٹ جائے گی، کچھ لوگ کشکول گدائی اٹھانے پر مجبور ہو جائیں گے ___ ماہرین کی کمی پیداوار میں کمی کا سبب ہو گی۔ پھر احساسِ محرومی اور افراطِ زر دونوں انسان کو دیوانہ بنا دیں گے۔

اگر ذرائع پیداوار بھی آزاد ہوں اور بازار بھی آزاد ہو تو فطرت خود توازن پیدا کرے گی ___ آج کے معاشرے میں ہولناک عدم توازن گواہی دے رہا ہے کہ ذرائع پیداوار بھی ظلم و بے انصافی کا اسیر ہے اور بازار پر بھی ظلم و بے انصافی کا قبضہ ہے ___ ایکطرف وہ لوگ ہیں جن کی ساری ضرورتیں پوری ہو چکی ہیں۔ ان میں ضرورت کا مصنوعی احساس پیدا کرنے کے لئے سُپر مارکیٹ سجائے جاتے ہیں۔ نمائش گاہیں آراستہ کیجاتی ہیں۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جنکی فطری ضرورتیں پوری نہیں ہو رہی ہیں وہ انھیں پوری کرنے کے لئے انسانی قدروں اور اخلاقی جذبوں کو بیچ دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اسقدر شکم سیر ہیں کہ ایک لقمے کی بھی گنجائش باقی نہیں۔ ان میں مصنوعی اشتہا پیدا کرنے کے لئے فائیو اسٹار ہوٹلوں میں نئی نئی ڈشیں سجائی جاتی ہیں، کھانے کی میزوں کے زاویئے بدلے جاتے ہیں۔ اشتہا انگیز پلیٹیں ڈھونڈی جاتی ہیں، خوبصورت و

خوش لباس خادم مہیا کیئے جاتے ہیں، اور ایسی موسیقی ترتیب دی جاتی جو مزید کچھ کھانے پر مجبور کردے۔ دوسری طرف اسی ہوٹل کی سیڑھیوں پر کچھ میلے کچیلے بچے عورتیں اور معذور خالی پیالے لئے ان کا جھوٹا کھانا پھینکے جانے کا انتظار کرتے ہیں۔

بڑا آدمی

جب معاشرہ صراطِ مستقیم سے ہٹ جاتا ہے تو اس کا زاویۂ فکر بھی ٹیڑھا ہو جاتا ہے۔

منطقی نقطۂ نظر سے بڑا آدمی وہی ہے جو انسانیت کو کچھ دے، عالمِ انسانیت کے لئے کوئی چیز عالمِ وجود میں لائے ـــــ بڑا آدمی اینٹ بنانے والا مزدور ہے کہ وہ انسان کے کام آنے والی ایک شے کو عالمِ وجود میں لایا ہے جو پہلے نہیں تھی، بڑا آدمی وہ جھاڑو دینے والا مزدور ہے جو محلّے کے لئے صفائی کو عالمِ وجود میں لا رہا ہے۔ بڑا آدمی وہ نجّار ہے جس نے لکڑی کاٹ کے ایک میز بنا دی ہے جو پہلے موجود نہیں تھی، یقیناً بڑا آدمی وہ انجینیر ہے جو عالمِ انسانیت کے لئے ایک "گھڑی" عالمِ وجود میں لایا ہے۔ بڑا آدمی وہ ڈاکٹر ہے جس نے ایک بیمار کو صحت مند بنا دیا ہے۔ بڑا آدمی وہ سائنس داں ہے جس نے انسانوں کو بچانے کے لئے ایک دوا ایجاد کر دی ہے جو پہلے موجود نہیں تھی۔ بڑا آدمی وہ شاعر ہے جس نے انسانیت کے ادبی ذخیرے میں چند شعر کا اضافہ کیا ہے۔ بڑا آدمی وہ مصنّف ہے جس نے انسانیّت کی راہ میں اپنے قلم کا چراغ جلایا ہے بڑا آدمی وہ معلّم ہے جس نے اپنے علم کے سانچے میں وہ کردار ڈھالا ہے جو

پہلے نہیں تھا۔ بڑے آدمی وہ والدین ہیں جنہوں نے لائق اولاد پال کے انسانی سماج کے حوالے کی ہے ــــ ان میں کون کس سے بڑا ہے۔؟ اسکا فیصلہ تخلیق کی افادیت اور اس افادیت کی عمر سے ہوگا۔

مگر بڑا آدمی وہ کیسے بن گیا جو کروڑ دو کروڑ، ارب دو ارب روپے کا مالک ہے؟ کیا اس نے یہ دولت پیدا کی ہے؟ نہیں ــــ محاورۃً تو پیدا کی ہے مگر حقیقتاً نہیں۔ یہ دولت پہلے بھی بزمِ انسانیت میں موجود تھی۔ بس فرق اتنا ہوا ہے کہ پہلے دوسروں کے جیب میں تھی اب اس نے اپنی جیب میں سمیٹ کے اکٹھا کرلی ہے۔

بڑا آدمی وہ کیسے ہوا جو لاکھ دو لاکھ ایکڑ زمین کا مالک بن گیا ہے۔؟ کیا یہ زمین وہ عالمِ وجود میں لایا ہے؟ــ نہیں ــ بلکہ یہ زمین پہلے بھی موجود تھی۔ بس وہ اس کا مالک بن گیا ہے ــــ سماج جب فاسد ہوتا ہے تو چھوٹا، بڑا بن جاتا ہے۔ بڑا چھوٹا کہا جانے لگتا ہے۔

خرد کا نام جنوں پڑ گیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

عہدِ رسالت میں

اب میں تاریخ کی انگلی تھام کے عہدِ رسالت میں قدم رکھتا ہوں۔

یہ مدینہ ہے۔ میرے نبیؐ کا مدینہ! ـــــ اب نہ وہ زمین ہے نہ وہ آسمان! نئی دنیا، نیا ماحول، نئے افراد، نئے رشتے ـــــ سیرتوں کے اجالے سی فضائیں جگمگا رہی ہیں، کرداروں کی خوشبو سے ہوائیں مہک رہی ہیں۔ یہاں کسی کا قد دولت و غربت اور نسل و خاندان کے پیمانوں سے نہیں، کردار کے فیتے سے ناپا جاتا ہے ـــــ یہاں اعلان ہو رہا ہے۔

☆ اگر تم مومن ہو تو سب سے سربلند ہو۔ (آلِ عمران ۳۹)

نہ عرب کو عجم پر کوئی سبقت حاصل ہے نہ قریش کو کسی غیر قریش پر کوئی برتری۔ عظمت و بزرگی اور ذلّت و رسوائی کے سارے پیمانے ٹوٹے پڑے ہیں۔

اب نہ بھاری عمامے دکھائی دیتے ہیں نہ لمبی قبائیں، نہ کاندھوں پر ریشمی لبادے ہیں نہ ہاتھوں میں سونے کے کڑے۔

صنادیدِ عرب کی عظمتوں کے سارے ستون گر رہے ہیں۔ قریشی اشرافیت کی دیواریں منہدم ہو رہی ہیں۔ نسلی برتری کا غرور دم توڑ رہا ہے۔ قبائلی عصبیّتوں کی سانس اکھڑ رہی ہے۔ وحدتِ انسانی کا سورج

طلوع ہو رہا ہے۔ انسانوں کے بنائے ہوئے نظریات کے بت ٹوٹ رہے ہیں۔ جاہلیت کی تاریکیاں مٹ رہی ہیں۔ عقل و منطق کا اجالا پھیل رہا ہے ــــ بلالؓ کی آواز گونج رہی ہے۔

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِؐ

غلاموں کی پرچھائیوں پر قدم رکھنے کو توہین سمجھنے والے سردار غلاموں کے سائے میں بیٹھے ہیں۔ سرمایہ داروں کے سروں کی دستاریں محنت کشوں کے قدموں میں گر رہی ہیں۔ ہزاروں سال سے ذلیل سمجھے جانے والے نماز کی امامت کر رہے ہیں ــــ غلام بنانے کے سارے راستے بند کر دیئے گئے ہیں اور غلاموں کی آزادی کے سیکڑوں راستے کھول دیئے گئے ہیں۔

اب نہ رات کو قبروں سے مردے نکلتے ہیں[1] نہ دن کو جنگلی بھوت (غولِ بیابانی) کسی کا راستہ روکتے ہیں[2]۔ نہ کاہن قسمت کا حال بتاتے ہیں، نہ نجومی زائچہ بناتے ہیں، نہ راہب فال نکال کے کسی کو بیوقوف بناتے ہیں[3]۔ ایک سجدے کے ذریعہ انسان کو ہزاروں سجدوں سے نجات مل رہی ہے۔ غربت اور امارت کی حد بندیاں ٹوٹ رہی ہیں ــــ انسانیت نے ایسے

---

[1] [2] [3]:۔ عہدِ جاہلیت میں مشہور تھا کہ اکثر مر جانے والے اپنی قبروں سے نکلتے ہیں چنانچہ مشہور تھا کہ حاتم طائی اپنی قبر سے نکل کے سفید گھوڑے پر سوار لوگوں کی مدد کرتے ہیں (المسعودی حصّہ دوم ۱۰۹)

نوٹ:۔ حضرت عمر نے ایک جنگلی بھوت سے مقابلہ کیا اور اسے قتل کر دیا۔ (المسعودی حصّہ دوم ۱۰۵)
افسوس کہ یہ جاہلی تصوّرات پھر مسلمانوں کے سماج میں پلٹ آئے۔ پیامؔ

معاشرے کا تجربہ کم از کم عہدِ تاریخ میں کبھی نہیں کیا تھا۔
لوگ کہتے ہیں کہ انسانی سماج سے اقتصادی ناہمواری کیسے مٹائی جاسکتی ہے؟ تاریخ کہتی ہے کہ آؤ اور آکے! پیغمبرؐ کے مدینہ میں دیکھو! اور مجھے بتاؤ کہ یہاں کون غریب ہے؟ اور کون امیر ہے؟

اس لئے کہ کسی کے پاس کچھ نہیں ہے نہ غربت نہ امارت۔ اس سماج نے سب کچھ اپنے مالک کے حوالے کردیا ہے۔

★ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ (الفرقان)

اللہ نے مومنین سے ان کی جان اور ان کا مال خرید لیا ہے۔

اس معاشرے میں اعلان کردیا گیا ہے.....

★ زمین پر جو کچھ پیدا ہوتا ہے وہ محنت سے پیدا ہوتا ہے اسلئے پیداوار کا اصل مالک محنت کش ہے۔

(ہمارے اقتصادیات کا جائزہ... شہید صدر)

★ آلات اور مشینیں محنت کی خادم ہیں نہ کہ محنت آلات اور مشینوں کی خادم۔ (شہید صدر)

★ بغیر محنت کے کوئی کسی چیز کا مالک نہیں بن سکتا! نہ سرمایہ نہ آلات۔ (شہید صدر)

★ کرایہ پر وہی چیز دی جاسکتی ہے جو محنت سے پیدا ہوئی ہو اور اس میں چھپی ہوئی صلاحیت خرچ ہوتی ہو۔ (شہید صدر)

★ ثروت، ثروت نہیں پیدا کر سکتی۔ (شہید صدر)

★ بغیر آباد کاری اور محنت کے زمین پر کوئی حق نہیں پیدا ہوتا۔ (شہید صدر)

★ اگر طبعی مصادر سے کسی کے عمل کے آثار محو ہو جائیں اور جگہ اپنی پرانی حالت پر پلٹ آئے تو دوسرے ہر فرد کو حق ہے کہ اسے آباد کرے۔ (شہید صدر)

★ اجرت دے کے مزدوروں سے آباد کاری میں سرمایہ دار کا کوئی حق نہیں۔ (شہید صدر)

★ کسی شے یا مزدور کو کرائے پر لے کر زیادہ کرائے پر دوسروں کو دینا حرام ہے۔ (شہید صدر)

★ عمل اور محنت کے بغیر کوئی کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔

(شہید صدر)

★ مختلف روایات میں وارد ہوا ہے کہ مرسلِ اعظمؐ نے ایک مخصوص مدت کے لئے زمین کو کرائے پر دینے کی ممانعت کر دی تھی اور اعلان کر دیا تھا کہ جس کے پاس جو زمین ہے وہ خود زراعت کرے یا اپنے بھائی کو دیدے۔ تہائی، چوتھائی یا معین مقدار پر دینے کا حق نہیں۔

(ہمارے اقتصادیات کا جائزہ صفحہ ۸۲)

دوسری روایت میں ہے کہ جس کے پاس کوئی زمین ہے وہ خود زراعت کرے ورنہ اپنے بھائی کو عطا کردے۔ اگر انکار کرے تو زبردستی چھین لی جائے۔

(ہمارے اقتصادیات کا جائزہ۔ صفحہ ۸۳)

تیسری روایت میں جابر ابن عبداللہ نے نقل کیا ہے کہ جس کے پاس کوئی زمین ہے وہ خود زراعت نہ کرسکے تو اپنے بھائی کو دیدے۔ خبردار کرائے پر نہ دے۔ (بحوالۂ مذکورہ)

★ اسلامی قانون ہے کہ پورے سماج کو ایک جیسی زندگی فراہم کی جائے۔ (شہید صدر)

★ ذخیرہ اندوزی اور احتکار حرام ہے۔ (شہید صدر)

★ طفیلی یا دلالی کے ذریعہ کسی چیز کی قیمت بڑھا کے پیداوار میں حصہ بٹانا حرام ہے۔ (ہمارے اقتصادیات کا جائزہ صفحہ ۸۸)

حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ثروت سے ثروت نہ پیدا ہونے دے۔
اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ انسان کو دوسرے انسان کی اقتصادی غلامی سے آزاد کردے۔

... نہ کوئی کسی کا استحصال کرسکے نہ استعمار۔ یعنی کوئی اپنی محنت کی قیمت زیادہ نہ حاصل کرے اور کسی کی محنت کو کم قیمت پر نہ خرید سکے۔ پیداوار میں اضافہ کرنا پورے سماج کی ذمہ داری ہے جس کی حیثیت جہاد راہِ الٰہی کی ہے۔

اسراف حرام ہے:۔ اسراف کیا ہے اسے شہید آقائے باقرالصدر کی زبانی سنئے:

"سماج میں تکمیل ضرورت کی عمومی سطح سے زیادہ سامان خرچ کرنا اسراف ہے۔ اس کا تعلق رائج الوقت سطحِ زندگی سے ہے"۔ (ہمارے اقتصادیات کا جائزہ)

اس کا مطلب ہے کہ اگر پورا سماج دو جوڑے کپڑے استعمال کرتا ہے تو کسی کو حق نہیں کہ چار جوڑے استعمال کرے اگر سماج کی عمومی غذا ایک سالن ہے تو کسی کو حق نہیں کہ اظہارِ برتری کے لئے دو سالن استعمال کرے۔

"تبذیر اسراف سے بڑا جرم ہے۔ تبذیر کا مطلب ہے لغویات پر دولت صرف کرنا مثلاً "کتے پالنا"، کھیل کود کی رقم خواہ مختصر ہی کیوں نہ ہو، اسلامی قانون کے اعتبار سے حرام ہے"۔ (ہمارے اقتصادیات کا جائزہ۔ ترجمہ علامہ جوادی رحمۃ اللہ)

اگر پیداوار کا ایک بڑا حصہ مختلف کھیلوں، لایعنی تفریحوں، بے مقصد مقابلوں اور بے مصرف جانوروں کو پالنے پر خرچ ہو رہا ہو اور دوسری طرف لاکھوں انسان بھوکوں مر رہے ہوں تو یہ انسانیت کے ساتھ خیانت نہیں تو اور کیا ہے؟

"اسلامی سماج میں نمائش بھی جائز نہیں ہے۔ خوشبو لگانا

اگرچہ مستحب ہے مگر مومنین کے مقابلے میں تشخص پیدا کرنے کے لئے حرام ہے"۔ (گناہانِ کبیرہ۔ آیۃ اللہ دست غیب)

الغرض پیغمبرؐ کے قائم کئے ہوئے سماج نے بچے کھچے قریشی اور انصاری سرمایہ داروں کی جیبوں میں پھنسے ہوئے درہم و دینار کو ٹھیکری سے بھی کم قیمت بنا دیا تھا۔۔۔ کہاں خرچ کریں؟ کیسے خرچ کریں؟۔۔۔

اب نہ بھاری عمامے بن سکتے ہیں نہ لمبی قبائیں ۔۔۔ پھر جمع ہو جانے والی رقم کیا ہو؟ قرآن کی آواز آرہی ہے:

★ "اے پیغمبرؐ! یہ لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ راہِ خدا میں کیا خرچ کریں فرما دیجئے جو ضرورت سے بچ جائے سب خرچ کر دیں"۔ (بقرۃ ۲۱۹)

کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا کوئی انسان اپنی ضرورت پوری کرنے کے بعد بچا ہوا مال کسی ضرورت مند کو دے سکتا ہے؟ کیا یہ آیت تعویذ بنانے کے لئے نازل ہوئی ہے۔؟

نہیں! اس آیت پر عہدِ پیغمبرؐ میں عمل ہو چکا ہے۔ یہ آیت سماج پر حکومت کر چکی ہے ۔۔۔ آج بھی اگر آدمی کو یقین ہو جائے کہ ہمارا اور ہمارے بچوں کا مستقبل محفوظ ہے اور آنیوالی صبح ہمارے لئے رزق کے نئے دروازے کھول دے گی اور اگر آج بھی آدمی کو یقین ہو جائے کہ ہمیں اگر فاقہ کرنا پڑا تو سب سے پہلے سماج کا سرپرست اور معاشرے کا "ولی"

اپنے بھوکے پیٹ پر پتھر باندھے ہوئے نظر آئے گا اور اس کے بچے ہمارے بچوں سے پہلے فاقہ کرتے ہوئے دکھائی دیں گے تو کوئی بھی بڑی آسانی سے رات کو سونے سے پہلے اپنے دوسرے ضرورت مند بھائی کے لئے اپنی جیب خالی کر سکتا ہے۔

ایسے سماج میں احتکار اور ذخیرہ اندوزی کی گنجائش کہاں؟

میں سوچتا ہوں! ایک خوبصورت کھلا ہوا پھول لوگوں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ فطرت کا کوئی بھی خوبصورت منظر سب کو مجبور کر دیتا ہے کہ وہ اسے مرکزِ نظر بنا لیں۔

میں نے دیکھا ہے! سب نے دیکھا ہے کسی راستے میں اگر کوئی چھتنار درخت سایہ کئے ہوئے کھڑا ہوا ہو۔ تو دھوپ میں راستہ چلنے والے مسافروں کے قدم بے تحاشہ اس کی طرف اٹھ ہی جاتے ہیں۔ فطرت انہیں مجبور کرتی ہے کہ وہ دھوپ کی شدّت سے بچنے کے لئے اس کے سایہ میں بیٹھ جائیں۔ انہیں اس کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ یہ درخت کسی مسلمان نے لگایا ہے یا غیر مسلم نے۔ یہ درخت عربی ہے یا عجمی؟

کیسے ممکن ہے؟ کہ عدلِ اجتماعی کا فطری سماج سایہ دار درخت بن کے کھڑا ہو اور بے انصافی کی دھوپ میں جلتی ہوئی انسانیّت اسے نظر انداز کر کے آگے بڑھ جائے ــــــ نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ مجھے اس سماج کی ماہیت! تاریخ سے پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

قرآن خود گواہی دے رہا ہے لوگ فوج در فوج اس کے سائے میں آنے کی کوشش کر رہے تھے۔

★ وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ۝

(نصر۔ ۲)

اے نبیؐ تم دیکھ لو کہ لوگ فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں۔

مگر آج چودہ سو سال بعد سلگتی ہوئی انسانیت تاریخ سے سوال کرتی ہے:

اس کڑی دھوپ میں جل جائے نہ انساں کا وجود
رہِ ہستی میں کہیں سایۂ دیوار بھی ہے

اور تاریخ جواب دیتی ہے! عدل و انصاف کے اس شجر سایہ دار کو اسی کی لکڑیوں سے بنی ہوئی کلہاڑیوں نے کاٹ کے گرا دیا۔
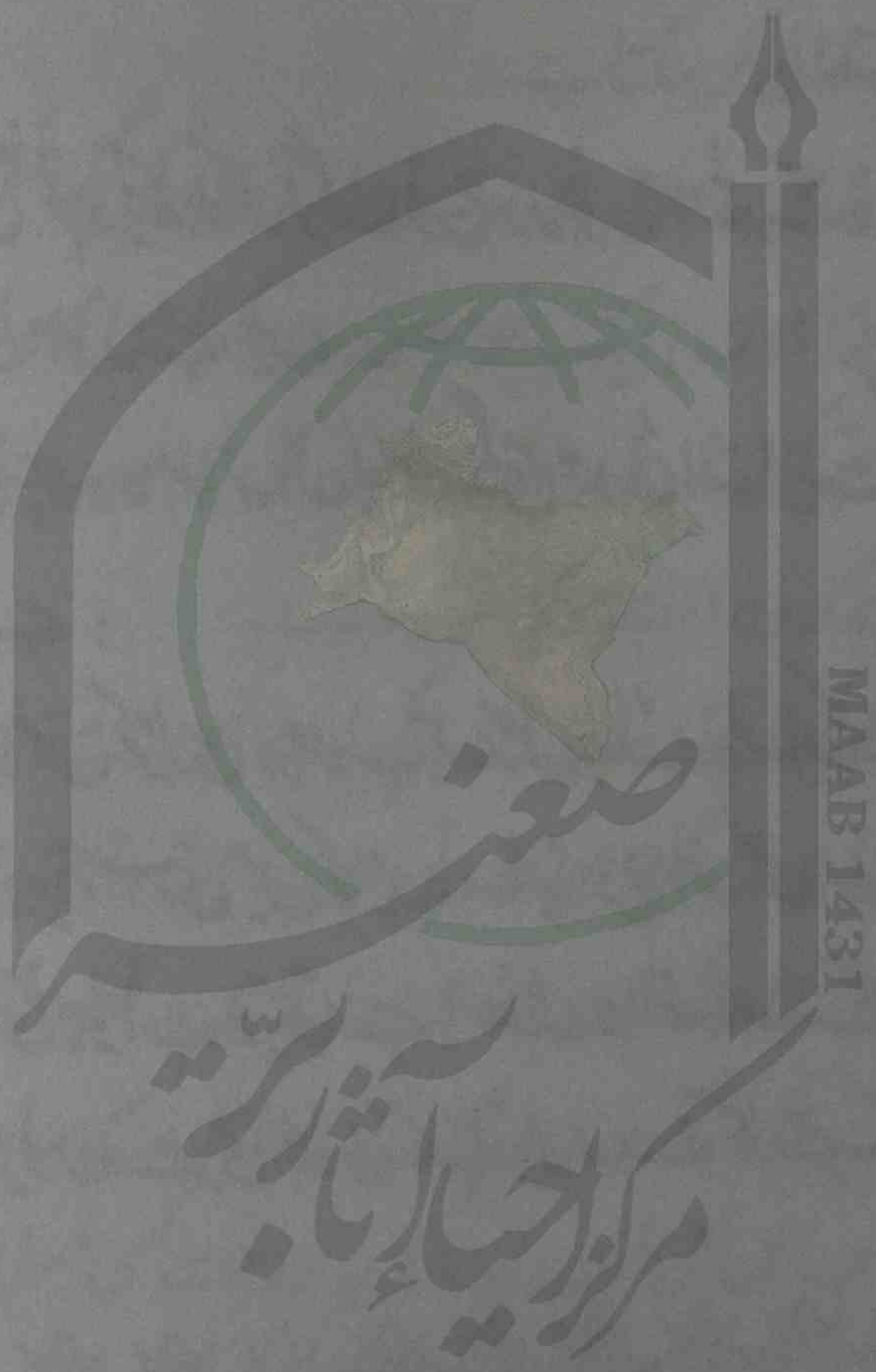
سماج یا حکومت

وہ عدل اجتماعی کی بنیاد پر قائم ہونے والا صرف ایک سماج تھا ــــ الٰہی سماج ــــ قرآنی معاشرہ! ــــ

وہ نہ حکومت تھی نہ سلطنت، نہ راعی تھا نہ رعایا، نہ حاکم تھے نہ محکوم نہ رئیس تھے نہ ریاست! ــــ جی ہاں پیغمبر اکرمؐ نے نہ کوئی حکومت قائم کی تھی نہ کسی سلطنت کی بنیاد رکھی تھی، نہ کسی نئے قسم کا اقتدار ایجاد کیا تھا۔ سب محکوم تھے حاکم صرف رب العالمین تھا، سب مملوک تھے، "مالک الملک" صرف ذاتِ الٰہی تھی۔

نبی آخرؐ کو کوئی نئی حکومت قائم کرنے کی ضرورت نہ تھی ــــ حکومت تو ہمیشہ سے قائم ہے، وہی ازلی و ابدی حکومت! ــــ جو پوری کائنات کو اپنی گرفت میں لیئے ہوئے ہے۔

★ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔ (البقرہ ۱۰۷)

کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہی صرف اللہ کیلئے ہے۔

★ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ ــــ (فرقان ۲)

پیغمبر اکرمؐ کا کام کسی نئی حکومت کی تشکیل نہیں بلکہ اسی لامتناہی حکومت کا احساس دلا کے اس کا ادراک کرا کے اسکا اعتراف کرانا تھا۔ "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ"

کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے۔؟

اور "محمدٌ رسولُ اللہ" کا مفہوم ہے کہ محمدؐ عربی کی ذات، احکم الحاکمین کے احکام کے حصول کا ذریعہ اور اس کی نمائندہ ہے۔

پیغمبرؐ اس قرآنی سماج کے "باپ" تھے رئیسِ مملکت نہیں! سماج کے سرپرست تھے حاکم نہیں، سماج کے سربراہ تھے بادشاہ نہیں! — ہم انھیں حاکم کہہ سکتے ہیں مگر انھیں معنوں میں جن معنوں میں کسی خاندان کے بزرگ کو اس خاندان کا حاکم کہتے ہیں — جن معنوں میں اولاد اپنے باپ کو حاکم سمجھتی ہے۔

وہ سماج، تاریخ کے گھماؤ پھراؤ، پیداوار اور ذرائع پیداوار کے اتار چڑھاؤ، یا جغرافیائی حالات کے دباؤ سے عالمِ وجود میں نہیں آیا تھا — آسمانی ہدایت کے مطابق، عقل و منطق کی روشنی میں، لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی بنیاد پر قائم ہوا تھا اور قرآن کی آب و ہوا پر پروان چڑھ رہا تھا۔

اس سماج کی ہر چیز اسلامی تھی — ادب و احترام کے پیمانے بھی۔ عزت و وقار کے اوزان بھی۔ معیار بھی۔ اقدار بھی۔

عدل و انصاف سے چھلکتا ہوا، یقین و اطمینان کے چراغوں سے منوّر، پیار اور محبّت کی خوشبو سے معطّر، — بے خوف اور پُرسکون سماج، اپنی منزلِ تکمیل کی طرف آگے بڑھ رہا تھا۔

جہاں نہ تخت تھا نہ پایۂ تخت، سارے فیصلے محرابِ عبادت میں

ہوتے تھے ـــــ نہ فوج تھی نہ لشکر، بلکہ پورا سماج "حزب اللہ" اور سماج کا ہر فرد اللہ کا سپاہی تھا۔

وہ قرآن کی آغوش میں برپا ہونے والا ایک خاندان تھا۔

★ لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا (الحجرات ۱۴)

اور اس سماج کا باپ، اس معاشرے کا سرپرست، دوسروں کے ساتھ، پتھر اٹھا اٹھا کے لاتا تھا، مٹّی کھودتا تھا، گارا بناتا تھا ـــــ اور اس کی بیٹی یوں چکّی پیستی تھی کہ اس کے ہاتھوں میں گھٹے پڑے ہوئے تھے۔ اللہ کی طرف سے نافذ ہونے والے احکام کی اطاعت سب سے پہلے سماج کے سرپرست پر واجب تھی۔

★ قُلْ اِنِّیْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّیْنَ وَ اُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِیْنَ (الزمر - ۱۲، ۱۳)

اے پیغمبر کہدو مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین اللہ کے لئے خالص کر کے اس کی بندگی کروں۔ اور مجھے حکم ملا ہے کہ سب سے پہلے میں اطاعت کروں۔

اللہ! اس معاشرے کی ماہیّت کو سمجھنا اور سمجھانا کتنا مشکل کام ہے جو انسانی اقتدار اور "انسانی حکومت" کے بغیر قائم ہوا تھا۔

تاریخ انسانی کے دماغ میں اقتدار کی ہزاروں شکلیں بھری ہوئی ہیں۔ ـــــ خود کو خدا کہنے والے بادشاہ ـــــ انسان کے بجائے دیوتا سمجھے جانے

والے سلاطین ـــــ ظلِّ الٰہی یعنی خدا کا سایہ سمجھے جانے والے مطلق العنان اہلِ اقتدار ـــــ وہ حکمراں جو کہتے تھے کہ ہمیں خدا بادشاہ بناتا ہے جس طرح سورج کے طلوع و غروب کا فیصلہ اس کے ہاتھ میں ہے۔ چند افراد کی مشترکہ حکومتوں کا بھی تصوّر ہے۔ جس میں چند افراد آقا ہوتے تھے باقی سب غلام ـــــ اموی اور عبّاسی نظامِ مملکت بھی ہے جس کا دعویٰ تھا کہ سلطنت عطیۂ پروردگار ہے ـــــ انسانی تصوّر میں جمہوری حکومتیں بھی ہیں اور اشتراکی ریاستیں بھی۔

کتنا بڑا ظلم ہے کہ اس الٰہی سماج کو بھی لوگوں نے ہمیشہ انھیں سیاسی اقتداروں اور انسانوں کی قائم کی ہوئی حکومتوں کے تناظر میں رکھ کے دیکھنے کی کوشش کی ہے ـــــ پھر ظالم تاریخ نے اسلامی حکومت، اسلامی سلطنت، اسلامی مملکت، اسلامی ریاست، اسلامی اقتدار جیسے الفاظ اس کثرت سے استعمال کیے گئے کہ پیغمبرِ اسلام کا قائم کیا ہوا عادلانہ معاشرہ ان سیاسی اصطلاحوں کے دبیز پردوں میں چھپ گیا۔

مسلم دانشوروں سے شکایت کیا۔؟ خود مسلم دانشوروں نے بھی اسی پس منظر میں عہدِ پیغمبرؐ کو دیکھنے کی کوشش کی ہے۔

ہوا یہ کہ پیغمبرؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی ـــــ اسلامی معاشرہ، اسلامی حکومت بن گیا۔ قریش کے قبائلی نظامِ اقتدار کو اسلامی لباس پہنا کے خلافت کے نام پر کھڑا کر دیا گیا۔ عادلانہ معاشرہ ختم ہو گیا، اسلامی حکومت

قائم ہوگئی ـــــ کردار سازی کا کام بند ہوگیا۔ مملکت سازی کا کام شروع ہوگیا ـــــ پہلی فرصت میں انسانی اقتدار کا ہیولا تیار ہوا۔ دوسری فرصت میں اس اقتدار کا پایۂ تخت فوج کے کاندھوں پر رکھ دیا گیا۔ تیسری فرصت میں اس اقتدار کو اللہ کی عطا کی ہوئی ذاتی ملکیت سمجھ کے "صلۂ رحم" کی ذمہ داری ادا کی جانے لگی ـــــ اور صرف پچاس سال بعد مطلق العنان بادشاہت۔!

متعدد ملکوں میں اسلامی حکومتیں آج بھی قائم ہیں جہاں قرآنی قوانین کا نفاذ بھی ہو رہا ہے۔ چور کے ہاتھ کاٹے جاتے ہیں۔ زانی کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ وراثت اور ازدواج کے اسلامی قوانین پر عمل درآمد ہو رہا ہے ـــــ مگر اسلامی روح اپنے معاشرے کے لئے تڑپ رہی ہے اور انسانیت کا اجتماعی ضمیر عادلانہ نظام کے لئے بے چین ہے۔

عدلِ الٰہی کا تقاضا تھا اور پیغمبر اکرمؐ کی ذمہ داری تھی کہ سفرِ آخرت اختیار کرنے سے پہلے اس عادلانہ معاشرے کو اپنے جیسا ایک سرپرست اور سربراہ مہیّا کر دیں۔

میں عقل و منطق کی روشنی میں دیکھ رہا ہوں۔ آثار و تاریخ کی شہادت موجود ہے کہ پیغمبرؐ نے وحیِ الٰہی کی روشنی میں، تعلیم و تربیت کے ذریعے اپنے بعد کے لئے ایک ایسا کردار پیدا کر دیا تھا۔ جو پیغمبروں کی طرح سوچ سکتا

تھا اور نبیوں کی طرح فیصلے کر سکتا تھا۔ جو آسمان سے نازل ہونے والی کتاب اور حکمت کا وارث تھا۔ پیغمبرؐ نے کسی مرحلے میں اسے جاہل نہیں چھوڑا تھا کہ اسے ذاتی اجتہاد سے کام لینا پڑے وہ مجتہد نہیں بلکہ الٰہی سماج اور الٰہی احکام کا عالم تھا۔ کیونکہ اگر اجتہاد کے ذریعہ سماج کی سرپرستی ہوگی تو خطائے اجتہادی کا خطرہ باقی رہیگا ـــــ ٹھیک ہے کہ خطائے اجتہادی کے مرتکب کو اللہ سزا نہ دے گا۔ مگر خطا بہر حال خطا ہے اس کے اثرات سے سماج محفوظ نہیں رہ سکتا ـــــــــــ ڈاکٹر اگر اپنی مخلصانہ تشخیص کی بنیاد پر کسی مریض کو غلط دوا دیدے تو ڈاکٹر کے بری الذمہ ہونے کے باوجود مریض کو ہلاکت سے نہیں بچایا جا سکتا۔

کیا ایسا انسان بروئے کار نہیں لایا جا سکتا جو نہ غلطی کرتا ہو نہ خطا؟
کیا ایسا انسان عالمِ وجود میں نہیں آسکتا جو نبیوں کی طرح معصوم ہو ـــــ اگر ہم اس بات کو مان لیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ اللہ نے انسان کو احسنِ تقویم پر پیدا کرنے کے بجائے خیر و شر کا مجموعہ بنایا ہے ـــــ یعنی اللہ کا مطلوب انسان نیکی اور بدی کے درمیان معلّق ہے ـــــ اور یہ بات قرآنی اعلانات کے خلاف ہے۔ آیاتِ الٰہی اس نظریئے کی تکذیب کرتے ہیں۔
کچھ لوگ یہاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ کسی غیر نبی کو نبیؐ کی طرح معصوم ماننا، نبوت کی توہین ہے۔ مگر میری عقل یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہے ـــــ

یہ نبیؐ کی توہین نہیں بلکہ نبوّت کا کمال ہے۔ کہ اللہ کا پیغمبر، اپنی پیغمبرانہ تربیت اور تعلیم سے اپنے جیسے کردار ڈھال دے۔

کوئی معلّم اپنے کسی شاگرد کو اس طرح تعلیم دے کہ وہ ہو بہو استاد کا نمونہ بن جائے تو شاگرد کا وجود استاد کی توہین کا سبب ہوگا یا اسکے کمال کا ثبوت ـــــ؟

کوئی بھی انسان اگر "علم و فراست، عقل و حکمت، تقویٰ اور پرہیزگاری طاقت اور شجاعت، نفسیاتی اعتدال اور جسمانی توازن کی آخری منزل پر پہونچ جائے۔ تو وہ کائنات کے آئینے میں لوحِ محفوظ کا مطالعہ کر سکتا ہے۔ اور حالات کے پردے اٹھا کے رضائے پروردگار معلوم کر سکتا ہے۔ وہ اپنی پہلی نظر میں جان لے گا کہ حق کیا ہے؟ باطل کیا ہے؟ صحیح کیا ہے؟ غلط کیا ہے؟ باطل، ـــــ حق کے ہزار خوبصورت غلافوں میں چھپ کے آئے مگر اس کی نگاہوں کی گرفت سے نہیں بچ سکتا۔ اس کی سماعت چیونٹی کی چال چلنے والے انحراف کی آواز سن لیتی ہے۔ اس کی نظریں چہروں سے گذر کے صلبوں کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہیں۔

اگر سلسلۂ نبوّت کا نقطۂ اختتام بھی ایسے انسانوں کو عالم وجود میں نہیں لا سکتا تو پھر اس طویل سلسلہ کا ماحصل کیا ہے۔؟
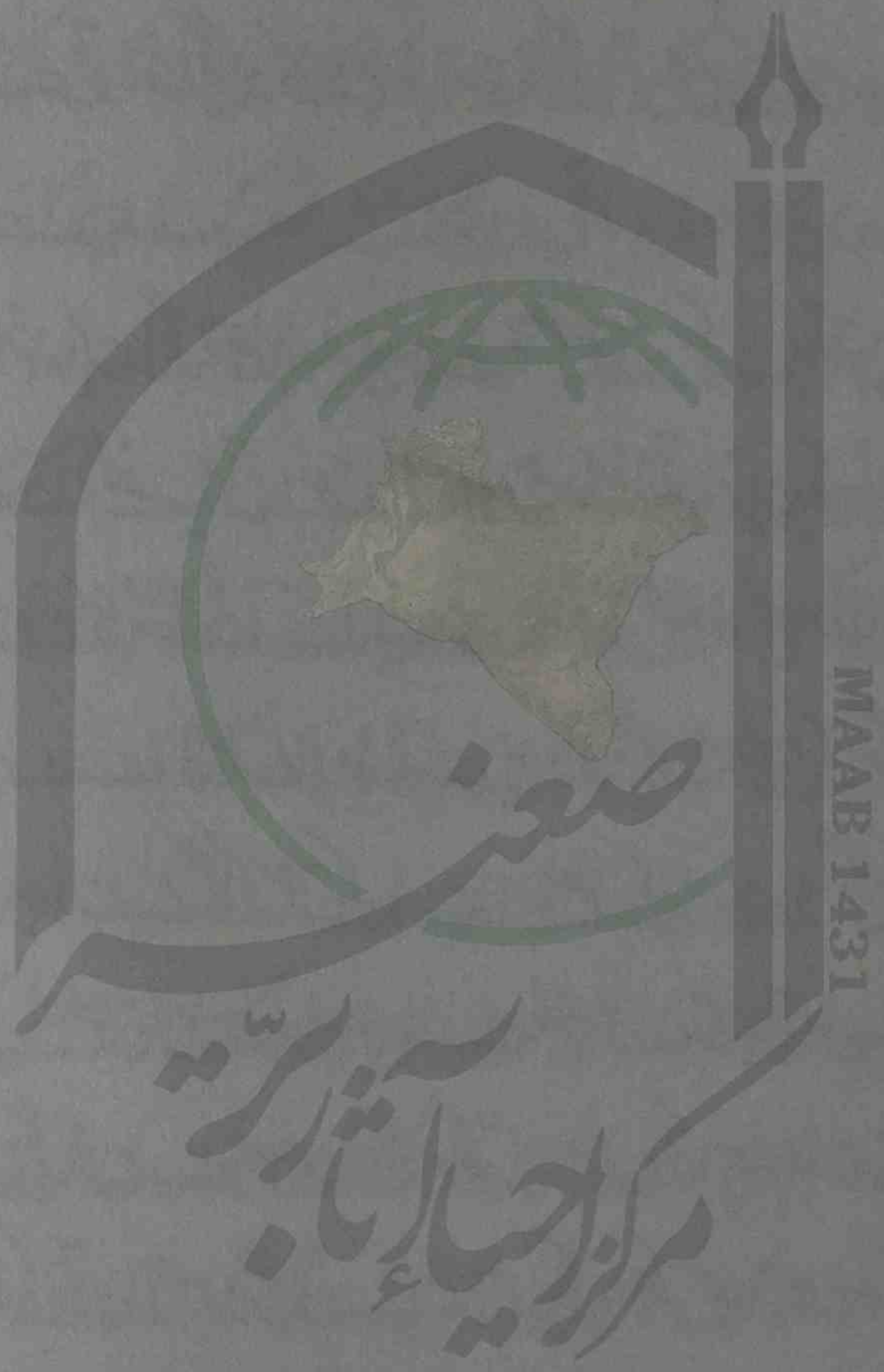
مُسلّمِ اوّل

اگر کوئی استاد یہ چاہتا ہے کہ وہ اپنے دل و دماغ میں محفوظ علم و معرفت کے سارے خزانے کو، اپنے تمام تجربات و واردات کو، اپنے کُل وہبی و اکتسابی ماحصل کو، سفرِ آخرت اختیار کرنے سے پہلے کسی دوسرے کے حوالے کردے اور کسی دوسرے کے دل و دماغ میں منتقل کردے ــــ تاکہ وہ محفوظ رہیں اور ان سے انسان و انسانیّت کی رہنمائی ہوتی رہے۔ تو اس کے لئے لازم ہے کہ وہ ایک ایسا شاگرد تلاش کرے، جس کی ذہنی سطح اس کی ذہنی سطح کے برابر ہو، جس کی قوّتِ فہم ٹھیک اس کی قوّتِ فہم کے مساوی ہو، جس کی "نفسیات" وہی ہوں جو اس کے نفسیات ہیں، دونوں کا مزاج ایک ہو، طبیعت ایک ہو، احساسات یکساں ہوں، دونوں کا خاندانی پس منظر ایک ہو، توارثِ صفات میں دونوں برابر کے شریک ہوں، اصلاب و ارحام کی وادیوں میں دونوں ہم سفر رہے ہوں ــــ ایک ایسا شاگرد، جو اپنے استاد کی آنکھوں سے دیکھ سکتا ہو، استاد کے کانوں سے سن سکتا ہو اور استاد کے دماغ سے سوچ سکتا ہو۔

اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو ایک دماغ سے دوسرے دماغ میں علوم کی مکمل ترسیل اور معرفت کی صد فی صد تحویل بھی ممکن نہیں۔

مثلاً۔ ایک بھوکا انسان چاہتا ہے کہ لفظ "روٹی" کا مفہوم اور اس سے متعلق احساسات جو اس کے ذہن میں ہیں کسی دوسرے ذہن میں منتقل کردے تو اسے اپنے جیسا بھوکا انسان تلاش کرنا پڑے گا ورنہ کسی پُرشکم انسان کے لئے اس کا ادراک محال ہے۔

یا اگر آپ کے پاس ایک گلاس میں پانی بھرا ہوا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ سارا پانی دوسرے گلاس میں منتقل ہوجائے تو اسی سائز کا گلاس تلاش کرنا پڑے گا، یعنی اگر دوسرا گلاس حجم میں ذرا سا بھی کم ہوگیا تو پانی کی ایک مقدار کا ضائع ہوجانا یقینی ہے۔

اب سوچئے! پیغمبر اعظمؐ علم و معرفت کے بھی وارث ہیں جو ان پر وحی کے ذریعے نازل ہوا ہے اور اس کے بھی جو ان سے پہلے انبیاءِ ماسبق کے ذریعہ نازل ہوچکا ہے۔ کیا پیغمبرؐ آخر یہ ذخیرۂ علم اپنے ساتھ واپس لیجائیں گے؟ یا انسان و انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے چھوڑ جائیں گے۔؟ اگر واپس لے جائیں گے تو نزول کا فائدہ؟ پھر قرآن ہم سے کیوں مطالبہ کرتا ہے کہ جو نبیِ آخرؐ پر نازل ہوا ہے اسے بھی مانو! اور اس سے پہلے جو نازل ہوچکا ہے اسے بھی مانو!؟ ——— اور اگر چھوڑ جائیں گے تو کہاں؟ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاءؑ کا بوجھ کون سنبھالے گا؟ کس کے دل میں ان حقائق کا بار اٹھانے کی طاقت ہے جو اگر پہاڑ پر نازل ہوتے تو اسے چکنا چور کردیتے۔

مگر عدالتِ الٰہیہ کا تقاضا ہے کہ رسولؐ کو ہمیشہ کے لئے واپس بُلانے

سے پہلے ایک ایسا انسان پیدا کردے جو عظمت و بزرگی کی اسی بلندی پر کھڑا ہو جہاں پیغمبرؐ کھڑے ہیں ورنہ مکمل ترسیل کا عمل ناممکن ہوگا ضروری ہے کہ اللہ ایک ایسے انسان کو عالمِ وجود میں لائے جس کے سینے میں انبیاء کا دل دھڑکتا ہو۔ ایسا انسان جو زمان و مکان، مزاج و طبیعت، فہم و ادراک کے لحاظ سے پیغمبرؐ سے متصل ہو اتنا قریب ہو کہ اسے نفسِ رسولؐ کہا جاسکے، اتنا مماثل ہو کہ چادر اوڑھ کے اگر سو جائے تو لوگ سمجھیں کہ پیغمبرؐ سو رہے ہیں۔ جس کے لئے نبیِ اعظمؐ کہہ سکیں کہ میں اس سے ہوں وہ مجھ سے ہے —— اس فرق کے باوجود کہ اس پر براہِ راست وحی نہیں نازل ہوتی۔ مگر وہ وحیِ الٰہی کا مفہوم ٹھیک اسی طرح سمجھتا ہو جس طرح پیغمبرؐ سمجھتے ہیں جس کا معنوی قد پیغمبرؐ کے معنوی قد کے عین برابر ہو —— تاکہ تحویل و ترسیل کا عمل مکمل ہو سکے۔ تاکہ سلسلۂ نبوّت کے منقطع ہونے پر ہدایت کا ایک ایسا سلسلہ قائم ہو سکے جو نبوت کا متبادل ہو —— تاکہ پیغمبر اسلام تمام سرمایۂ وحیِ الٰہی اس عظیم انسان کے حوالے کر کے دائمی حفاظت کا انتظام کر دیں۔ اور پورے یقین و اعتماد کے ساتھ "مَنْ کُنْتُ مَوْلَاہُ فَھٰذَا عَلِیٌّ مَوْلَاہُ" کا اعلان کر کے "فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ" کی ذمہ داری پوری کر دیں۔ تاکہ نبیؐ کے بعد بھی نبوّت کا مشن جاری رہے۔
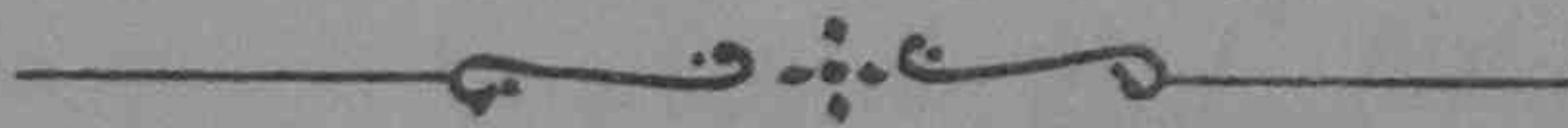
سقیفہ نہیں غدیر

فلسفۂ ختمِ نبوّت:۔ کیا کبھی آپ نے سوچا ہے کہ اللہ تبارک وتعالی نے ہزاروں سال تک جاری رہنے والے رشتۂ نبوت اور سلسلۂ رسالت کو اچانک کیوں منقطع کر دیا۔؟

حضرت آدمؑ سے شروع ہونے والا نزولِ وحی کا سلسلہ حضرت محمّد مصطفےٰؐ کی ذاتِ گرامی صفات پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کیوں ختم ہو گیا۔؟

کیا مادرِ انسانیت بانجھ ہو چکی تھی اور ایسا انسان پیدا کرنے سے قاصر تھی جو عالمِ غیب سے رابطہ قائم کر سکے کیا زمین کی کوکھ سرد ہو چکی تھی اور ایسا فرزند نہیں پیدا کر سکتی تھی جو آسمان سے رشتہ جوڑ لے۔؟

کیا شعورِ انسانی کی نگاہِ بصیرت اب اندھی ہو چکی تھی اور لوحِ محفوظ کا مطالعہ کرنے سے قاصر تھی۔؟ کیا احسنِ تقویم پر پیدا ہونے والی انسانیت اپنی سماعت کھو چکی تھی اور اب آسمانی آواز سننے سے معذور تھی، کیا سجودِ ملک اب فرشتوں سے گفتگو کرنے کے قابل نہیں رہ گیا تھا؟ اور چونکہ قدرت کو کوئی ایسا فرد نہیں مل سکا جو نبوّت کی ذمہ داریوں کو سنبھال سکے اس لئے اس مقدّس سلسلے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔

اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں نکلتا کہ انسانیّت

عروج کے بجائے زوال کی طرف سفر کر رہی تھی تاریخ کا رُخ بلندی کے بجائے پستی کی طرف تھا اس طرح رفتہ رفتہ سلسلۂ رسالت کمزور سے کمزور تر ہوتا گیا۔ اور آخری ہچکی لے کے ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گیا اور پھر یہ بھی کہنا پڑے گا کہ سب سے بڑے نبی حضرت آدمؑ تھے پھر نبوّت کا قد چھوٹا ہوتے ہوتے معدوم ہو گیا۔ (معاذ اللہ)

ظاہر ہے کہ یہ تصوّر قرآن و حدیث، عقل و تاریخ کے کھلے ہوئے فیصلے کے خلاف ہے اور اس کافرانہ نظریہ کو کوئی مسلمان ماننے کے لئے تیار نہیں ہے۔

پھر دوسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اپنے بندوں سے اب تک خوش اور راضی تھا اس لئے نزولِ وحی کی برکتوں سے اپنے بندوں کو نوازتا رہا مگر اب عہدِ محمدیؐ میں ناراض و غضبناک ہو کر بابِ وحی کو ہمیشہ کے لئے بند کر لیا اور فرشتوں کو زمین پر اترنے کی ممانعت کر دی ـــــ لیکن ایسا ہوتا تو پیغمبرؐ کی زندگی کے آخری دنوں میں تکمیل دین اور اتمامِ نعمت کے اعلان کے بجائے دین کی ناکامی اور نعمتوں کی واپسی کا اعلان ہوتا اور امّتِ محمدیؐ کو امتِ مرحومہ کے بجائے امتِ مغضوبہ کا سرٹیفکیٹ عطا کر دیا جاتا۔

تیسرا سبب یہ ہو سکتا ہے کہ انسان و انسانیت اس منزلِ کمال پر پہونچ چکی تھی جہاں اسے آسمانی ہدایت کی کوئی ضرورت نہیں تھی، اور غیبی رہنمائی سے بے نیاز ہو چکی تھی۔ اور جادۂ حیات میں وہ نہ کسی وحی کی محتاج تھی نہ اسے پیغمبروں کی احتیاج تھی ـــــ اور قدرت نے دیکھا

کہ انسان اب اتنا شریف، بے ضرر اور معصوم ہو چکا ہے کہ اب وہ نہ قتل و غارتگری پر مائل ہو گا نہ استحصال و استعمار کرے گا۔ فساد فکری و مادی کے سارے دروازے بند ہو چکے ہیں۔ شہوانی خواہشات اور حیوانی جذبات کے سارے سرچشمے سوکھ چکے ہیں۔ اب اسے اقتدار کی ہوس ہے نہ حکومت کی، اب انسان عمداً یا سہواً کوئی غلطی نہیں کر سکتا انحراف و گمراہی کے خطرات ختم ہو چکے ہیں لہٰذا سلسلۂ نبوت کو باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی باہوش انسان اس نظریے کو بھی تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسانیت نے جب زمین پر قدم رکھا تو وہ اس نوزائیدہ بچے کے مانند تھی جو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتا لہٰذا ضروری تھا کہ "وحی" کے ذریعہ سہارا دیا جائے اور فرشتوں کی انگلی تھام کر شعور و ادراک کی راہوں پر چلنا سیکھے۔

حضرت آدمؑ سے شروع ہو کر حضرت محمد مصطفےٰؐ کی حیات کے ساتھ ختم ہونے والا عہدِ نبوّت دراصل انسانی شعور کی "تربیّت" کا زمانہ تھا۔

اور جب تاریخ عہدِ ترقی تک پہونچ گئی .....

شعور انسانی بلوغ کی منزلیں سر کر چکا ___ اور اس ترسیل و ابلاغ کے مرحلے سر کر لینے کی صلاحیت پیدا ہو چکی ___ غیبی حقائق کا ادراک آسان ہو گیا وہ علمی اور دینی ورثے کی حفاظت اور اسے آنے والی نسلوں

تک پہونچانے کا طور طریقہ سیکھ گیا۔ ساتھ ہی ساتھ اجتماعی زندگی گوناگوں تبدیلیوں کے بعد اس منزل میں داخل ہو گئی جہاں کسی بنیادی تبدیلی کا امکان نہیں رہ گیا۔

تو اللہ تبارک و تعالیٰ نے قیامت تک کام آنے والا ابدی قانون قرآنِ حکیم کی شکل میں نازل کر کے نزولِ وحی کے سلسلے کو ہمیشہ کے لئے بند کر دیا ــــ اور پیغمبرؐ تمام قابلِ ادراک غیبی حقائق بیان کر کے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے ــــ اور قرآن نے اعلان کر دیا کہ:

"اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ"

لیکن اگر کوئی شعور و ادراک کی ترقی، تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا یہ مطلب سمجھتا ہے کہ اب انسان ہر طرح کے انحراف و گمراہی کے خطرے سے باہر نکل چکا تھا اور انسانوں کا ازلی دشمن شیطان واصلِ جہنم ہو چکا تھا، غلط کاری و غلط فکری کے سارے راستے بند ہو چکے تھے، مسلمانوں کی جماعت انبیاء کی طرح معصوم اور محفوظ عن الخطاء ہو چکی تھی اب نہ اسے آسمانی ہدایت کی ضرورت تھی نہ معصوم رہنمائی کی ــــ تو یہ ٹھیک ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ دعویٰ کرے کہ اب انسان آنکھوں کے بجائے دانتوں سے دیکھنے لگا تھا اور پاؤں کے بجائے سر کے بل دوڑنے لگا تھا، پانی میں سانس لیتا تھا اور ہواؤں میں تیرتا تھا۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ انسان عہدِ نبوّت ختم ہونے کے بعد بھی بالکل

پہلے ہی جیسا انسان تھا۔ جذبات ونفسیات کی پُرپیچ وادیوں میں بھٹکتا ہوا۔ بلکہ مادی ایجادات میں اضافے کی وجہ سے بھی زیادہ خطرناک ہو چکا تھا۔ سماجی عوامل کی پیچیدگیوں میں اضافے کی وجہ سے بھی گمراہی کا خطرہ اور زیادہ بڑھ گیا تھا، اندھیروں میں رہنے والے اس انسان کی طرح جس نے چراغ جلانا سیکھ لیا ہو اور گھروں کو روشن کرنے کے ساتھ انھیں چراغوں سے گھروں کو جلا کے برباد بھی کر سکتا ہو۔ جس طرح کل فرعون ونمرود پیدا ہوئے ٹھیک اسی طرح اب بھی پیدا ہو سکتے تھے۔ بلکہ ماضی کے فرعون ونمرود کے مقابلہ میں مستقبل میں فرعون ونمرود کہیں زیادہ بھیانک اور دہشت ناک ہونے والے تھے کیوں کہ استحصال واستخفاف کے ذرائع بہت بڑھ چکے تھے ــــ لہٰذا آج کا انسان کل کے انسان کے مقابلے میں آسمانی ہدایت اور معصوم رہنمائی کا زیادہ محتاج تھا۔

بھیجی وہ چیز جاتی ہے جس کی ضرورت ہو اور روکی وہ چیز جاتی ہے جس کی ضرورت ختم ہو چکی ہو اب انسان کو نزولِ وحی اور پیغام رسانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ اب اسلام کے دامن میں قرآن وحدیث کی شکل میں سب کچھ موجود تھا۔ مگر اس کی حفاظت اور سماج کی معصوم سرپرستی آج بھی ضروری تھی۔

اگر رسالت اور نزولِ وحی کا سلسلہ اب بھی باقی رہتا تو یہ "فعلِ عبث" اور تکرار لاحاصل کے مترادف تھا۔ جو شانِ خداوندی کے خلاف ہے۔

اگر خدا ہدایت و ولایت کے سلسلے کو بھی منقطع کر دیتا تو یہ ظلم تھا اور ظلم عدل الٰہی کے خلاف ہے۔

ایک مثالی انسان کی ضرورت

لہٰذا عقلِ انسانی اس کے علاوہ کوئی دوسرا فیصلہ کرنے کے لئے تیار نہیں کہ سلسلۂ رسالت کے ٹوٹتے ہی ایک ایسے ولی اور رہنما کی ضرورت ہے۔ جو نبی نہ ہو مگر مزاج نبوت کا حامل ہو۔ پیغمبر نہ ہو مگر پیغمبرانہ شعور کا مالک ہو، جس کے سینے میں انبیاء کا دل دھڑکتا ہو، جو رسولوں کے دماغ سے سوچتا ہو۔

جس پر قرآن نہ نازل ہوا ہو مگر اس کی نگاہِ بصیرت قرآن کے بین السطور سے گذر کر لوحِ محفوظ کا مطالعہ کرتی ہو، جس کی نظریں چہروں کے پردے الٹ کر صلبوں کا جائزہ لے سکیں۔ جس کا علم زمین و آسمان کا احاطہ کئے ہو، جس کی بصارت شہود کے ذریعہ غیب کا مطالعہ کرتی ہو۔

جو پہاڑوں کی طرح ثابت قدم، دریاؤں کی طرح رواں دواں، سمندروں کی طرح پُر جوش اور کسی صاف شفاف جھیل کی طرح ٹھہرے ہوئے جذبات کا مالک ہو جسے دنیا کی کوئی طاقت نہ خوف زدہ کر سکے نہ اعصابی تناؤ کا شکار بنا سکے نہ جذباتی ہیجان میں مبتلا کر سکے۔ جسے خود اپنی ذات پر اپنی قوتوں پر اپنے ارادوں پر اتنا قابو حاصل ہو کہ جب چاہے پوری طاقت سے چلائی ہوئی تلوار کو دشمن کے سر پر لیجا کے روک لے

اور چمکتی ہوئی تلواروں میں گہری نیند سو جائے۔ جب دشمن پر حملہ کرے تو غصہ نہ آئے اور جب غصہ آجائے تو حریف کے سینے سے اتر جائے۔

جو بیک وقت دنیا کا سب سے بڑا خطیب بھی ہو اور حکیم بھی۔ جو نفسیات کی گرہوں کو پہچانتا بھی ہو اور انھیں کھولنا بھی جانتا ہو۔ جو معاشی پیچیدگیوں سے بھی واقف ہو اور انکا حل بھی جانتا ہو، جو انحراف اور شرک کی آواز سن لے خواہ وہ چیونٹی کی رفتار سے سماج میں داخل ہو رہی ہوں، جو دنیا کا سب سے بڑا مجاہد بھی ہو اور عبادت گذار بھی۔

جو دنیا کا سب سے بڑا شجاع بھی اور جفاکش بھی، جو دنیا کا سب سے بڑا سخی بھی ہو اور کفایت شعار بھی، جو صاحبِ قلم بھی ہو اور صاحبِ ذو الفقار بھی، جو فلسفی بھی ہو اور منطقی بھی۔ جو ماہرِ ادبیات بھی ہو اور ماہرِ لسانیات بھی اس لئے کہ سماج انھیں اوصاف و روابط سے بنتا ہے۔ جو قرآن کے بتائے ہوئے معیارِ سیادت کے مطابق سب سے زیادہ "قوتِ جسم" بھی رکھتا ہو اور وسعتِ علم بھی جس پر کتاب نہ اتری ہو مگر "رَاسِخُونَ فِي الْعِلْمِ" اور "عِنْدَهُ عِلْمُ الْكِتَابِ" جیسے قرآنی اشاروں کا مصداق ہو اور "اٰتَيْنَا اٰلَ اِبْرَاهِيْمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ" اور قرآنی اعلان اس کا تعارف کرا رہا ہو جو قرآنی الفاظ کے سینے میں اتر کے مشیّت کا راز دار بن جائے۔

جو دریاؤں کے دل ہلا دینے والا طوفان اور "جگرِ لالہ" میں ٹھنڈک پیدا کر دینے والی شبنم ہو جو محرابِ عبادات میں ریشم کی طرح نرم اور میدانِ

ملائے۔ جب کچھ بولے تو ایسا لگے کہ قرآن آواز دے رہا ہے وہ کچھ کہے تو محسوس ہو کہ نبیؐ پکار رہا ہے ـــــ وہ مردِ بے کراں جو انسانی ہدایت کے لئے فرشتوں کی مدد کا محتاج نہ ہو اور نوعِ بشر کی رہنمائی کے لئے اُسے وحیِ الٰہی کا انتظار نہ کرنا پڑے۔

غدیر کی طرف

یہ ناممکن ہے کہ ایسے انسان کو عالمِ وجود میں لائے بغیر ــــ ایسے مردِ بیکراں کو ذخیرہ کئے بغیر ــــ ایسے کردارِ عظیم کو پیدا کئے بغیر ــــ اور اس کی ولایت کا اعلان کئے بغیر ــــ اللہ وحی کا دروازہ بند کرے اور ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کی ہدایت کے طولانی سلسلے کو اچانک منقطع کردے۔

انسانیت کے حق میں یہ ٹھیک ویسا ہی ہے جیسے کوئی کسی انسان کو لاکھوں فٹ کی بلندی پر لے جاکے یکبارگی نیچے ڈھکیل دے کہ جب وہ گرے تو اس کی لاش کا بھی پتہ نہ چل سکے۔

خدائے رحیم و کریم کا اپنے کمزور ناتواں بندوں سے یہ برتاؤ اتنا بڑا ظلم ہے کہ جس کا تصوّر بھی بارگاہِ الٰہی میں گستاخی ہے۔

آپ کہیں گے کہ ہدایت و ولایت کے اس معیار پر علیؑ کے علاوہ کوئی پورا نہیں اترتا، تو بھائی میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ اوصافِ حمیدہ کی یہ قبائے ملکوتی اگر کسی دوسرے کے جسم پر فٹ ہو جائے تو پہنا دیجئے، مگر للہ آدمی کو کارٹون نہ بنائیے!

جنگ میں فولاد کی طرح سخت ہو جس کی تلوار دنیائے کفر میں قیامت برپا کردے اور جس کے اقوال سیاست کی گرہیں اور جس کی دعائیں دلوں کے دروازے کھول دیں۔

جو اتنا بڑا اجری ہو کہ اس کی تیغ کی جھنکار صدیوں تک فضائے عالم میں گونجتی رہے اور اتنا بڑا صابر بھی ہو کہ اس کی جان سے زیادہ عزیز شریکِ حیات کی پہلو کی ہڈیاں توڑ دی جائیں اور وہ گھر میں بیٹھا اس کی درد بھری آواز سنتا رہے اپنے قوی ہاتھوں میں انبیاء کی میراث سنبھالے ہوئے ـــــ صرف یہ سوچ کر کہ اگر میں اٹھا تو یہ امانت ضائع ہو جائے گی۔

جو اتنی بڑی سیاسی بصیرت کا مالک ہو کہ خود اس کے نبی کی بیوی جب اس سے جنگ کرے تو وہ اسے شکست بھی دیدے اور اپنے نبیؐ کے ناموس کو بھی مجروح نہ ہونے دے۔

سمندروں کی بھی تھاہ لگ جاتی ہے اور اس کی سرحدیں بھی کہیں نہ کہیں ساحل سے ہم آغوش ہو جاتی ہیں مگر وہ "مردِ بے کراں" جس کی کوئی تھاہ نہیں جس کا کوئی کنارہ نہیں جس کا کوئی سرا نہ مل سکے عقل و خرد کے سارے پیمانے بنتے بگڑتے رہیں مگر اس کے قد و قامت کی پیمائش نہ کر سکیں۔

وہ قد آور انسان کہ جب کھڑا ہو تو انبیاء کے کاندھے سے کاندھا

"لَایَنَالُ عَھْدِی الظّٰالِمِیْنَ" کا مطلب اس کے علاوہ اور کیا ہے
کہ قدرت کسی راہ چلتے کو پکڑ کے نہ نبی بناتی ہے نہ امام ـــــ الٰہی عہدے نہ
پانسہ پھینک کر تقسیم کیئے جاتے ہیں نہ قرعہ اندازی کے ذریعہ ـــــ "تو نہیں
اور سہی اور نہیں اور سہی" کا جمہوری اصول زمین پر رائج ہو گا آسمان پر نہیں۔

روزِ ازل خدا اگر مسئلۂ خلافت کو اپنی معصوم مخلوق فرشتوں کی رائے
کے حوالے کر دیتا تو وہ حضرتِ آدمؑ کا انتخاب کبھی نہ کرتے ـــــ تو پھر آپ کیوں
چاہتے ہیں کہ قدرت اپنی سنّت تبدیل کر دے اور ولایت کو ہم جیسے خاطی
انسانوں کے حوالے کر دے جو نبوّت اور رسالت کا حصّہ ہے اور اتنا عظیم
انسان جو نبی نہ ہوتے ہوئے بھی بارِ رسالت اٹھانے والا ہے ـــــ کیا
اچانک پیدا ہو جائے گا؟ جب کہ ایک معمولی سا درخت بھی برسوں میں
اس قابل ہوتا ہے کہ اس سے پھل یا پھول حاصل کیئے جا سکیں۔

یاد رکھئے کہ قدرت ہزاروں سال زمین و آسمان کو لاکھوں بار گردش
دیتی ہے اور تاریخ زمانے کی سرد و گرم وادیوں سے صدیوں تک گذرتی
رہتی ہے تب کہیں جا کے مادرِ انسانیت اس قابل ہوتی ہے کہ اس کی کوکھ
سے محمدؐ اور علیؑ جیسے عظیم انسان پیدا ہو سکیں۔

یہ قدرت کا اتنی دور سے اہتمام و انتظام ہی ہے کہ ہزاروں سال
پہلے حضرت ابراہیمؑ اپنی بیوی اور اپنے کمسن فرزند حضرتِ اسمٰعیلؑ کو ایک
وادیٔ غیر ذی زرع میں تنہا چھوڑ آتے ہیں اوپر سوکھا آسمان نیچے پتھریلی

زمین تپتی ہوئی سنگلاخ وادیاں نہ آدم نہ آدم زاد، نہ چرند نہ پرند، نہ وحش نہ طیور، نہ گھاس نہ سبزہ، نہ خار نہ خس۔ وہاں اللہ نے اسی خانوادے کو آباد ہونے کا حکم دے دیا ہے۔

ذرا سوچئے ایسی جگہ زندگی گذارنا جوئے شیر لانے سے بھی زیادہ بڑا کام ہے کہ نہیں۔ اس چھوٹے سے کنبے کو اپنا ایک دن کا آذوقہ حاصل کرنے میں اتنی مشقت و جانفشانی سے ضرور گذرنا پڑتا تھا کہ کسی زرخیز وادی کے رہنے والے اگر اتنی محنت بروئے کار لائیں تو کم از کم ایک سال کا رزق فراہم کر لیں۔

آخر ایسی جگہ اللہ نے حضرت اسمٰعیل کو گھر بسانے کا حکم کیوں دیا۔ جہاں زندہ رہنا اور سامانِ زندگی اکٹھا کرنا ہزاروں جہاد کے برابر تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ خدائے حکیم و خبیر اسی طرح حضرتِ ابراہیمؑ و اسمٰعیلؑ کے ذریعہ ایک ایسے خاندان کو عالمِ وجود میں لا رہا ہے اور ایک ایسی نسل برپا کر رہا ہے جو دنیا کی تمام نسلوں میں سب سے زیادہ شریف ترین سب سے زیادہ مشقت پسند، سب سے زیادہ جفاکش، سب سے زیادہ صابر و شاکر سب سے زیادہ قوّتِ برداشت رکھنے والی اور سب سے زیادہ قربانی و ایثار پر کمربستہ رہنے والی نسل ہو۔ ہر طرح کی سماجی آلودگیوں سے پاک اور مسلسل انحراف کی وجہ سے بگڑے معاشرے سے الگ رکھ کر ایک ایسی نسل کی نشو و نما کا انتظام کرنا جو ایسے افراد کو جنم دے سکے جو شرک اور بُت پرستی کے خلاف دنیا

میں سب سے زیادہ حساس ہوں۔

اور پھر قدرت اصلاب کے ساتھ ارحام پر بھی پوری طرح نظر رکھے ہوئے دکھائی دیتی ہے۔ حضرت اسمٰعیلؑ عقد کرتے ہیں اور ایک شریکِ زندگی کو گھر میں لاتے ہیں۔ کچھ دن بعد حضرتِ ابراہیمؑ تشریف لے جاتے ہیں وہ خاتون سخت اور بھیانک حالات کی شکایت کرتی ہیں حضرت ابراہیمؑ اسمٰعیلؑ کو پیغام دیتے ہیں کہ ان سے کہنا کہ چوکھٹ تبدیل کر دیں۔ حضرت اسمٰعیلؑ اپنی زوجہ کو طلاق دے کر دوسری شادی کرتے ہیں حضرت ابراہیمؑ پھر پہونچتے ہیں اور یہ دوسری خاتون بھی حالات کی شکایت کرتی ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ پھر وہی پیغام دیتے ہیں کہ اسمٰعیل سے کہنا کہ چوکھٹ تبدیل کر دیں حضرتِ اسمٰعیلؑ اپنی اس زوجہ کو الگ کر دیتے ہیں اور جب وہ خاتون اسمٰعیلؑ کے گھر میں آجاتی ہیں جو شکایت کے بجائے شکرِ خدا کرتی ہیں اور حالات کی سنگینی کا اظہار کرنے کے بجائے اظہارِ اطمینان کرتی ہیں تو جناب ابراہیمؑ اس رشتے کو باقی رہنے کا حکم دے دیتے ہیں۔

ان خواتین کا جنہیں حضرت اسمٰعیلؑ نے الگ کر دیا تھا قصور اس کے علاوہ کچھ نہیں تھا کہ انھوں نے تکلیف کو تکلیف سمجھا مصیبت کو مصیبت بتایا تھا بس۔ لیکن قدرت کا فیصلہ بتا رہا ہے جو خاتون حالات کی سختی پر شکر کے بجائے شکایت کرے وہ اس قابل نہیں ہے کہ اس کے بطن سے

مطلوبہ نسل مہیّا کی جاسکے جس کی قربانیاں دین کی زندگی کی ضمانت بننے والی ہیں۔

تاریخ نے پوری تفصیلات سے تو پردہ نہیں اٹھایا ہے مگر قرائن کہتے ہیں کہ قدرت نے اس نسل شریف کے سلسلے میں اس اہتمام کو آخر تک باقی رکھا ہوگا۔ اور جب اصلابِ شامخہ اور ارحامِ مطہرہ سے گذر کے یہ نسل اپنے نقطۂ عروج پر پہونچی تو وہ مطلوبہ انسان عالم وجود میں آہی گیا ہے جسے ہم علیؑ کہتے ہیں۔

آپ کہیں گے کہ یہ سارا اہتمام "وجودِ محمدیؐ" کے لئے تھا تو آپ کا دعویٰ تسلیم مگر آپ میرے اس دعوے کو کیسے رد کریں گے کہ جس استقامت وشجاعت، صبر ورضا، ایثار وقربانی، حکمت وفراست کی ضرورت عہدِ محمدیؐ کے بعد پڑنے والی تھی اتنی ضرورت نہ عہدِ محمدّی میں تھی نہ اس سے پہلے ــــ یعنی محمدؐ کے بعد محمدؐ کی ضرورت کہیں زیادہ تھی چنانچہ اس شجرِ طیبہ کی سب سے بلند وبالا شاخ پر تقریباً ۳۰ سال کے وقفے سے برابر کے دو پھول کھلے محمدؐ اور علیؑ۔ محمدؐ سلسلۂ نبوّت کا نقطۂ اختتام اور علیؑ۔ تاریخِ ولایت کا نقطۂ آغاز۔ شاید علّامہ اقبال کو تاریخ کی اس حقیقت کا احساس ہو گیا تھا تبھی تو انھیں کہنا پڑا۔ ؎

غریب وسادہ رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؑ ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

مگر قافلۂ حجاز کو کسی ابراہیمؑ، کسی اسمٰعیلؑ، کسی علیؑ اور کسی حسینؑ کی ضرورت کل بھی تھی اور آج بھی ہے۔

الغرض آدمؑ ہوں یا نوحؑ، ابراہیمؑ ہوں یا اسمٰعیل، سب کا سفر غدیر کی طرف تھا۔ سب انسانی شعور کے قافلے کو غدیر کی طرف بڑھا رہے تھے۔ سلسلۂ نبوّت سلسلۂ امامت کے لئے مقدّمہ کی حیثیت رکھتا ہے یعنی سلسلۂ رسالت غدیر تک پہونچنے کی تیاری کا نام ہے۔ ہر نبی کا رُخ غدیر کی طرف تھا۔ ہر رسولؐ غدیر کی طرف پیش قدمی کر رہا تھا۔ تاریخِ نبوّت تاریخِ ولایت کو بروئے کار لانے کے لئے زمین ہموار کر رہی تھی۔

خود پیغمبر آخرؐ کا رُخ شروع ہی سے غدیر کی طرف تھا۔ غدیر مسلمانوں کے لئے اچانک ظاہر ہونے والے حادثے کا نام نہیں ہے۔ سب جانتے تھے کہ پیغمبرؐ کا سفر کس سمت میں جاری ہے اور اللہ کا نبی مسلمانوں کو کہاں پہونچا کے رخصت ہونے والا ہے۔

"دعوتِ ذوالعشیرہ" کو غدیر کا مقدمہ نہیں تو اور کیا کہا جا سکتا ہے جب پیغمبرؐ آغاز ہی میں انجام کی خبر دے رہے تھے اور علیؑ کی خلافت و ولایت کا اعلان فرما رہے تھے۔

حدیث منزلت غدیر کی تمہید نہیں تو اور کیا ہے جب جنگ تبوک میں جاتے ہوئے اللہ کے رسولؐ نے یہ کہہ کے علیؑ کو اپنا قائم مقام بنایا تھا کہ اے علیؑ تمہاری منزلت میرے لئے وہی ہے جو موسیٰؑ کے لئے ہارونؑ

کی تھی۔

ہجرت کی رات غدیر کی دو پہر کا تعارف نہیں تو اور کیا تھا جب ختمی مرتبت اپنے پاس رکھی ہوئی امانتیں علیؑ کے حوالے کر کے اپنے بستر پر علیؑ کو سلا کر مدینے کی طرف سفر کر رہے تھے۔

خود کو شہرِ علم اور علیؑ کو اس کا دروازہ کہنا اعلانِ غدیر کا ضمیمہ نہیں تو اور کیا ہے یعنی پیغمبر مسلمانوں کو بتا رہے تھے کہ میرے بعد میرے لائے ہوئے علوم تک رسائی کا واحد ذریعہ ذاتِ علیؑ ہے۔

سورۂ برائت کی پیغام رسانی کی ذمہ داری دوسروں کے بجائے علیؑ کے حوالے کرنا "پیغامِ غدیر" کا پیش لفظ نہیں تو اور کیا ہے کہ گویا پیغمبرؐ نے بتایا کہ قرآنی ترسیل و ابلاغ کا مرحلہ میرے بعد علیؑ ہی سر کرے گا۔

جنگِ خیبر میں علیؑ کو علم دینے سے پہلے یہ کہنا کہ کل اسے عَلم دوں گا جو اللہ ورسولؐ کا محبوب ہے اور اللہ ورسولؐ اس کے محبوب ہیں۔ امت کی فکر کو غدیر کے راستے پر چلانے کی کوشش نہیں تو اور کیا ہے۔

جنگِ خندق میں علیؑ کو "کُلِّ ایمان" کہنا معاشرے کی مرکزی شخصیت کی نشاندہی نہیں تو اور کیا ہے۔

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ،... یَا اَیُّھَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ... الخ جیسے الٰہی احکامات، ـــ تاریخ غدیر کے نقطۂ کمال تک پہونچانے کا حکم نہیں تو اور کیا ہیں۔

ان بے شمار روایات و احادیث و آیات کی کہاں تک تاویل کروں اور کب تک اس سعیِ رائیگاں میں اپنا وقت برباد کروں۔

الغرض جب فکرِ اسلامی اور شعورِ انسانی اور وجدانِ ایمانی کا قافلہ اس منزلِ آخر پر پہونچ گیا جسے ہم غدیر کہتے ہیں۔ جس منزلِ آخر کا خواب ہر نبی نے دیکھا تھا جس کی جانب تاریخ مسلسل پیش رفت کر رہی تھی جو حیاتِ محمدّی کی منزلِ مقصود تھی۔ تو صدیوں سے جاری رہنے والا انبیائی سفر تمام ہوا۔ فرشتگانِ وحی اپنی خدمات سے سبک دوش ہوئے اور پیغمبرؐ نے ہدایت و امامت و ولایت کا بارِ عظیم اپنے کاندھوں سے علیؑ کے کاندھوں پر منتقل کر دیا۔

انقلابِ محمدؐ

ریگ زارِ عرب کے اُفق سے عہدِ جاہلیت کی شبِ تاریک کا سینہ چاک کر کے آج سے چودہ صدیوں پہلے ایک ایسا آفتاب طلوع ہوا تھا جس کی روشنی آج تک انسانی افکار و کردار کی وادیوں کو منوّر کیئے ہوئے ہے جس نے عظمت و کردار کی اس بلند ترین سطح سے انسانیت کو پکار اٹھا کہ اس کی صدائے بازگشت آج بھی سنائی دے رہی ہے۔ جس نے توحید و حق پرستی کا ایسا پیغام دیا تھا جو آج تک گونج رہا ہے۔ اس نے دنیا کو ان اخلاقی قدروں سے روشناس کیا جو اس سے پہلے اجنبی تھیں اور ایثار و قربانی کی ایسی مثالیں قائم کیں جس کا تجربہ تاریخ نے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔

وہ جامعۂ انسانی کو "اللہ کی کتاب" اور اپنی سیرت مقدسہ کی شکل میں ایسا ابدی ہدایت نامہ دے گیا جو آج نحیف و لاغر انسانیت کا آخری سہارا ہے۔ اس نے جاتے جاتے چھوٹا سا سہی مگر ایسا معاشرہ بھی قائم کر دیا تھا اور ایک ایسی حکومت کی بنیاد بھی رکھ دی تھی، جس میں ظلم و جور حق تلفی و ناانصافی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اگر وہ حکومت اور وہ معاشرہ باقی رہتا تو آج یہ دنیا ظلم و جور، استحصال و استعمار، اور کفر و شرک سے بھری

ہونے کے بجائے، عدل وانصاف اور فلاح وصلاح سے بھر چکی ہوتی۔

مگر اس کے بعد نہ وہ حکومت باقی رہی نہ وہ معاشرہ ..... اب اس امت کی کشتی طوفانوں کے رحم وکرم پر ہے۔ نہ اس کے خون کی کوئی قیمت ہے نہ عزت کی۔

آخر ایسا کیوں ہوا؟

کیا مرسلِ اعظمؐ نے اپنے بعد اس حکومت کی بقا کے لئے کوئی طریقۂ کار نہیں معین کیا تھا؟

کیا نبیِ آخرؐ امت کو اتفاقات وحادثات کے حوالے کر گئے تھے؟

کیا اللہ یہی چاہتا تھا کہ یہ امت صرف چند برسوں کے علاوہ ہمیشہ تباہ وبرباد رہے۔ اور دنیا کے مستضعفین کی مدد کرنے کے بجائے خود ہی مستضعف بن جائے؟۔

بہتر ہے کہ آپ اپنے دماغ کی کھڑکیوں کو بند رکھئے۔ ورنہ مذکورہ سوالوں کا جواب دینے کی کوشش ان عقائد کی جڑوں کو ہلا سکتی ہے جو باپ دادا سے ورثے میں ملے ہیں۔

تاریخ ہزاروں انقلاب کے واقعات ہمیں سناتی ہے اور چند انقلابوں کو ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ مگر یہ تمام انقلابات کسی ایک شعبۂ حیات میں برپا ہوئے اور زندگی کا فقط کوئی ایک رُخ تبدیل کر سکے۔

یعنی کبھی سیاسی نظریات کی تبدیلی کو انقلاب کہا گیا کبھی اقتصادی

نظام بدل جانے کو انقلاب کا نام دیا گیا کسی انقلاب کا نتیجہ صرف حکمرانوں کی تبدیلی تھی اور کسی انقلاب کا مقصد حکومت کو ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل کر دینا تھا۔ مثلاً ۱۹۴۷ء میں ہندوستان میں انقلاب آیا۔ اس انقلاب کا مفہوم ہے کہ زمامِ حکومت انگریزوں کے ہاتھوں سے نکل کر خود ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آگئی۔ انقلابِ روس کا مطلب ہے کہ ملک پر شہنشاہیت کی جگہ اشتراکیت کا تسلط ہو گیا۔

اور پھر یہ تمام انقلابات جنھوں نے زندگی کا کوئی ایک رُخ بدلنے میں کامیابی حاصل کی ان میں بھی طویل زمانے صرف ہوئے، بعض انقلابات کو بروئے کار لانے میں صدیوں کوششیں جاری رہیں، خود ہندوستان میں آزادی کی لڑائی تقریباً سو سال تک لڑی گئی، تب جا کے کامیابی ملی۔ یہی نہیں یہ انقلاب دو چار دس افراد کی کوششوں سے نہیں برپا ہوئے بلکہ قوم نے مل کے انھیں کامیاب بنایا۔

مگر وہ اسلامی انقلاب جو آج سے چودہ سو سال پہلے مرسلِ اعظم محمد مصطفٰے صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذریعہ بروئے کار لایا گیا تھا اس نے صرف زندگی کا کوئی ایک گوشہ، کوئی ایک رُخ نہیں تبدیل کیا تھا بلکہ اس نے نظامِ فکر سے لیکر نظامِ عمل تک سب کچھ بدل کے رکھ دیا تھا۔ معاشرت ہو یا معیشت، تہذیب ہو یا ثقافت، ادبی نظریات ہوں یا سماجی افکار، اجتماعی مسائل ہوں یا انفرادی ضرورتیں، خاندانی روابط ہوں یا علاقائی حدود، محبت و نفرت

کے مصادیق ہوں یا دوستی و دشمنی کے اہداف سب تبدیل ہو گئے تھے۔ نفع و نقصان کے معیارات، سوچنے سمجھنے کا ڈھنگ، دیکھنے سننے کے زاویئے، طبیعت، مزاج، خواہشیں، عقیدے اور عقیدتیں سب کچھ بدل گئی تھیں۔ الفاظ وہی تھے مگر نئے مفہوم میں بولے جا رہے تھے، رشتے وہی تھے مگر نئے تناظر میں دیکھے جا رہے تھے۔ اب لڑکیوں کو زندہ دفن کر دینے والے انھیں اپنی متاعِ حیات سمجھنے لگے تھے۔ بت گری کرنے والے بت شکنی کر رہے تھے، دوسروں کو قتل کر دینے والے راہِ الٰہی میں قتل ہو جانے کے متمنّی تھے، دوسروں کا گھر لوٹنے والے خود اپنا گھر لٹا رہے تھے، جو کل تک بلند تھے وہ پست نظر آنے لگے، جو پست تھے وہ بلند دکھائی دے رہے تھے، غلام آقا کے آگے چل رہا تھا۔ اسبابِ ذلّت وجہِ عزّت اور اسبابِ عزّت وجہِ ذلّت بن گئے تھے۔

اور یہ سب کچھ ۲۳ سال میں ہو گیا تھا۔ اتنا بڑا ہمہ جہت انقلاب جس کی مثال تاریخ کے دامن میں کہیں اور نہیں ملتی صرف ایک انسانؐ کی کوششوں کا رہینِ منت تھا۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر یہ بھی پیغمبر اسلامؐ کی رسالت کی دلیل نہیں تو پھر "دلیل" کہتے کسے ہیں؟۔ تخت و تاج کا سہارا لیئے بغیر، فوج و لشکر کی مدد کے بغیر صرف اخلاق و کردار کے ذریعہ پرانی مٹی سے نئے انسان تعمیر کر دینا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کارنامہ تھا۔

صرف ۲۳ سال میں پیغمبر آخرؐ نے معاشرے کو اخلاقیات کے

نقطۂ صفر سے اٹھا کر اس منزلِ بلند پر پہونچا دیا کہ چوری کرنے والا خود ہی درخواست کرتا تھا کہ میرے ہاتھ کاٹ دیں تاکہ ناراضگیٔ پروردگار سے بچ سکوں اور زنا کا ارتکاب ہو جانے کے بعد بزم رسالت میں گذارش پیش ہوتی تھی کہ مجھے سزائے موت دیدیں تاکہ اپنے مالک کی بارگاہ میں پاک ہو کے حاضری دوں ۔

جس سماج میں ابو جہل و ابو لہب پیدا ہو رہے تھے اسی سماج میں مقداد و عمار جیسے افراد نظر آنے لگے ۔ بے گناہوں کا خون بہا کے فخر کرنے والے راہِ حق میں جان دینے کے مواقع تلاش کرنے لگے تھے ۔ جس کی آواز پر علیؑ کے علاوہ کوئی لبیک کہنے والا نہ تھا صرف ۲۳ سال میں لاکھوں دلوں کی دھڑکن بن گئی تھی ۔ اور وہ اسلام جو ابو طالبؑ کے گھر کی چہار دیواری میں محدود تھا، عرب سے نکل کے باہر پہونچ رہا تھا۔

فرض کر لیجئے یہ صورتِ حال ۲۳ سال کے بجائے تین سو سال تک باقی رہتی اور اسلامی تاریخ اسی راستے پر اسی تیز رفتاری سے خیر و فلاح کی طرف بڑھتی رہتی اور اسلامی ضمیر، اسلامی مزاج، اسلامی شعور یونہی تین صدیوں تک "دن دونی رات چوگنی" ترقی کرتا رہتا ـــــ اگر ایسا ہوتا تو پورے کرۂ ارض پر آج اسلام کا عادلانہ نظام رائج ہوتا ۔ قتل و غارتگری ظلم و جور، فتنہ و فساد کا وجود تو در کنار، اس کا تصور بھی نہ باقی ہوتا ۔ اور آسمانی قیادت کے زیرِ نگرانی اتنی نسلیں گذر جاتیں کہ انحراف کا امکان

ہی ختم ہو جاتا۔

پھر کیا اللہ یہی چاہتا تھا کہ معصوم قیادت کا سلسلہ صرف ۲۳ سال باقی رہے اور پھر ہمیشہ امتِ اسلام بلکہ عالمِ انسانیت ظلم و جور کا نشانہ اور افتراق و انتشار کا شکار رہے؟

ہم پورے یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ مالکِ حقیقی نے اسلامی تاریخ کے لئے جو نظام معین کیا تھا وہ وفاتِ پیغمبرؐ کے بعد آگے نہیں بڑھ سکا، یعنی جو ہونا چاہیئے تھا وہ نہیں ہوا، جو ہوا وہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔ الٰہی نظامِ تاریخ تو یہ تھا کہ محمدؐ کے بعد بھی محمدیؐ قیادت کا سلسلہ باقی رہے اور اس سماج کی سرپرستی ایسے افراد کرتے رہیں جو محمدؐ جیسا دل و دماغ رکھتے ہوں اور محمدیؐ علم و شعور کے وارث ہوں ــــ اگر امت انکی اطاعت و قیادت تسلیم کر لیتی، ــــ اور تمام ائمہ معصومین بالفرض پیغمبرؐ کی طرح صرف ۲۳، ۲۳ سال اسلامی تاریخ کی سربراہی فرماتے اس طرح معصوم قیادت کی تین صدیاں گذر جاتیں اور تین سو سال تک تاریخ اسی رفتار اور اسی صورت سے آگے بڑھتی رہتی جو پیغمبرؐ اسلام کی حیاتِ مقدس میں تھی تو نہ اموی اور عباسی ٹکسالوں میں جھوٹی حدیثیں ڈھالی جاتیں نہ شاطرانِ سیاست فرضی روایتیں گڑھ سکتے، نہ نام نہاد مفسّرین تفسیر کے نام پر قرآنی مفاہیم پر پردہ ڈال سکتے۔ نہ اسلامی افکار غیر اسلامی افکار سے آلودہ ہوتے، نہ لایعنی بحثوں کے ذریعے اسلامی فکر کا استحصال ہوتا۔ امت

روایات ہیں، اور حقیقت میں کھو نہ جاتی بلکہ ایک ایسا اسلامی معاشرہ عالمِ وجود میں آجاتا جس کے دامن میں صرف صحیح احادیث، سچی روایات اور صرف معصومین کی قرآنی وضاحتیں ہوتیں اور ایک ایسا تعلیمی نظام ہوتا کہ جس میں آنکھیں کھولنے والا ہر مسلمان، عالمِ دین بھی ہوتا اور فقیہ بھی، مفسّر بھی ہوتا اور محدث بھی۔ وہ اپنا وظیفۂ عمل اور اپنی مسئولیت خود معلوم کر لیتا۔

مگر ایسا نہ ہو سکا، ابھی تو اسلام کے دامن میں آنکھیں کھولنے والی پہلی نسل بھی پوری طرح جوان نہیں ہو پائی تھی کہ پیغمبرؐ اسلام نے آنکھیں بند کر لیں۔ امت نے حضرت علیؑ کی معصوم قیادت سے رشتہ توڑ لیا۔ نتیجہ میں وہ تمام برائیاں جنھیں پیغمبرؐ کی معصوم قیادت بڑی تیز رفتاری سے ختم کرتی جا رہی تھی، ملیریا کے مچھر کی طرح اسلامی سماج میں واپس آگئیں۔ یہانتک کہ صرف پچاس سال بعد امت بے شعوری اور بے ضمیری کی اس سطح پر پہونچ گئی کہ اپنے ہی نبیؐ کے نواسے کو بھوکا پیاسا شہید کر دیا۔ اسلامی علوم جاہلوں کے ہاتھ کا کھلونا بن گئے۔ اب سب کچھ گنجلک ہو چکا ہے، سب کچھ آلودہ ہو چکا ہے۔ ...

گریۂ زہرا صلوات اللہ علیہا

پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہوتے ہی مدینے کی گلیاں یتیمۂ پیغمبرؐ فاطمہ زہراؑ کی دلخراش صداؤں سے گونجنے لگیں۔ گریۂ زہراؑ نے اہلِ مدینہ کو مضطرب کر دیا۔ سب اپنے اپنے کام پر لگ گئے مگر فاطمہؑ کے آنسو رُکنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ صبح رونا شام رونا۔ گھر میں رو رہی ہیں۔ بیتُ الحزن میں جا کر رو رہی ہیں ___ گھر کا کام کر رہی ہیں مگر روئے جا رہی ہیں۔ چکیاں پیس رہی ہیں مگر روئے جا رہی ہیں۔ مصلےٰ پر کھڑی ہیں مگر آنسو بہہ رہے ہیں۔ تلاوتِ قرآن ہو رہی ہے مگر سیلابِ اشک جاری ہے۔ ضعف و نقاہت بڑھتا جا رہا ہے مگر آنسو نہیں رک رہے ہیں۔ کمر خمیدہ ہو گئی مگر رونے کا سلسلہ جاری ہے۔ جب تک زندہ رہیں روتی رہیں اور اتنا روئیں کہ "گریۂ زہراؑ" ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اتنا گریہ کیوں؟ کیا صرف یتیمی کا احساس تھا جو فاطمہؑ کو اتنا رونے پر مجبور کر رہا تھا؟ کیا یہ صرف باپ کا غم تھا جو فاطمہؑ کو تڑپا رہا تھا؟ کیا صرف پیغمبرؐ کی جدائی کا اثر تھا جس نے فاطمہؑ کو بے چین کر رکھا تھا؟ کیا یہ صرف شفقتِ پدری سے محرومی کا اظہار تھا؟

فاطمہؑ تعلیماتِ پیغمبرؐ کا مجسمہ تھیں ۔ نبیِ آخرؐ کی نبوت کا شاہکار تھیں تعلیماتِ قرآنی کی بولتی ہوئی تصویر تھیں اور اس مزاج کی وارث تھیں جس کے نزدیک حیاتِ دنیا حیاتِ آخرت کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی ۔ اس خاندان کا مرکزی کردار تھیں جہاں زندگی موت میں کوئی فرق نہیں ۔ اس گھرانے میں اپنی یا اپنے عزیزوں کی زندگی اسی وقت تک پسندیدہ ہے جب تک حکمِ خدا ہے ۔ اور اگر مرضیِ خدا بدل جائے تو موت اتنی ہی عزیز جتنی عزیز زندگی تھی ـــــ پھر فاطمہ جانتی تھیں کہ پیغمبرؐ اسلام دنیا سے رخصت ہو کر مقامِ محمود پر پہونچ چکے ہیں اور الٰہی نعمتوں سے ہم آغوش ہیں ۔ وہ جانتی تھیں کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کے مقابلے میں حسین تر ہے ۔ انھیں معلوم تھا کہ اس دنیا کی زندگی میں پیغمبرؐ کے لئے آرام و راحت نام کی کوئی چیز نہیں تھی اور بعدِ انتقال جنّت کی زندگی میں سب کچھ ہے ـــــ اور یہی نہیں بلکہ پیغمبرؐ کی پیشین گوئی کے مطابق فاطمہؑ بہت تھوڑے وقفے کے بعد جنّت میں پہونچ کر اپنے والد بزرگوار سے مل جائیں گی یعنی جدائی کا زمانہ بہت مختصر ہے ـــــ پھر آخر گریۂ زہراؑ کا سبب کیا ہے ـــــ پیغمبرؐ کا غم؟ باپ کی جدائی؟ نہیں ایسا نہیں ہے ۔ صاف پتہ چلتا ہے کہ فاطمہ زہراؑ وفاتِ پیغمبرؐ کے پس منظر میں بہت کچھ دیکھ رہی تھیں ۔ ان کی نگاہیں باپ کی جدائی کے آئینے میں مسلمانوں کے بھیانک مستقبل پر تھیں ـــــ امت کی بہبودی کے لئے بے چین رہنے والے باپ کی حساس بیٹی دیکھ رہی تھی کہ تاریخ کا رخ بدل رہا ہے ۔

گریۂ زہرا کا مفہوم سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ تاریخ انسانی کے اس نازک ترین لمحے کا تجزیہ کریں جب پیغمبر اسلامؐ کی آنکھ بند ہو رہی تھی اور پیغمبرؐ دنیا سے سفر کر رہے تھے۔

پیغمبر اسلامؐ کی موت صرف ایک نبی کی موت نہیں تھی بلکہ قدرت کا ایک انتہائی اہم فیصلہ نافذ ہو رہا تھا۔ ایک ایسا فیصلہ جس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ یہ تاریخ انسانی کا ایک انتہائی نازک موڑ تھا ــــ یعنی زمین سے آسمان کا رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ٹوٹ رہا تھا۔ وحی کا دروازہ بند ہو رہا تھا۔ اب نہ کوئی کتاب اترنے والی ہے نہ کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے ــــ ابتک انسانی قیادت کی ذمہ داری انبیاءؑ و مرسلین پر تھی۔ جبرئیلؑ اور دوسرے آسمانی فرشتے مددگار تھے مگر اب تاریخ ایک ایسے دور میں داخل ہو رہی تھی جس میں قیادت اور امامت کا فریضہ ایک ایسے انسان کے کاندھوں پر آچکا تھا جو مزاجِ پیغمبریؐ کا وارث ہونے کے باوجود پیغمبر نہیں تھا۔ جو سیرت و کردار میں صفاتِ نبوی کا حامل ضرور تھا مگر نبی نہیں تھا۔ جو نفسِ رسولؐ تھا لیکن خود رسول نہیں تھا۔ جو صد فی صد علم کتاب کا حامل تھا مگر کتاب اس پر نہیں اتری تھی ــــ اللہ و رسولؐ نے اسے اسی دن کے لئے معین کیا تھا، تیار کیا تھا، بھیجا تھا کہ جب سلسلۂ نبوّت و رسالت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے منقطع ہو تو انسانی قیادت کی ذمہ داری یہ عظیم انسان سنبھال لے ــــ یقیناً دورِ انبیاءؑ میں بھی ایسے درمیانی وقفے رہے ہیں جب کوئی نبیؐ و رسولؐ زمین پر موجود نہیں تھا

مگر یہ سلسلہ اس سے پہلے کبھی قطع نہیں کیا گیا تھا۔ اللہ۔ کتنے بڑے دل و دماغ کا مالک تھا۔ وہ انسان جو فرشتوں کے رابطے اور واسطے کے بغیر انسانی قیادت کی ذمہ داری لینے کے لئے تیار تھا۔

پیغمبر اسلامؐ کی وفات تاریخ کے ان دونوں ادوار کے درمیان خطِ فاصل کی حیثیت رکھتی تھی اور پیغمبرؐ نے تاریخ کو ۲۳ سال میں جس راستے پر لگا دیا تھا وہ امن و سلامتی کا راستہ تھا۔ کامیابی و کامرانی کا راستہ تھا۔ سکون واطمینان کا راستہ تھا۔ تمام کرۂ ارض پر عدل اجتماعی کے قیام کا راستہ تھا۔ سب دیکھ رہے تھے۔ فاطمہؑ بھی دیکھ رہی تھیں کہ اگر تاریخ اسی نہج، اسی رفتار، اسی رُخ پر چلتی رہی تو مستقبل قریب میں ساری دنیا جنّت کا نمونہ بن جائے گی۔ ظلم و ستم کا خاتمہ ہوجائیگا۔ نہ کوئی مستکبر ہوگا نہ مستضعف، نہ ظالم ہوگا نہ مظلوم۔ زمین سے نعمتیں ابلنے لگیں گی اور آسمان سے رحمتیں برسنے لگیں گی۔

مگر— جب فاطمہؑ نے دیکھا کہ لوگ اس عظیم انسان کے خدمات حاصل کرنے سے انکار کررہے ہیں جسے پیغمبرؐ نے اسی دن کے لئے پالا تھا۔ مسلمان پیغمبرؐ کے قائم کئے ہوئے عادلانہ سماج کی قیادت کی ذمہ داری اسے نہیں سونپ رہے ہیں جو منصوص الٰہی تھا— تاریخ اپنا رُخ بدل رہی ہے۔ مسلمان اس راستے پر قدم رکھ رہے ہیں جو ہلاکت و فلاکت کا راستہ ہے، ظلم و جور کا راستہ ہے، کفر و نفاق کا راستہ ہے۔ شرک و توہّمات کا راستہ ہے۔ استعمار و استحصال کا راستہ ہے۔

فاطمہؑ کے پہلو میں پیغمبرؐ کا دل اور فاطمہؑ کی نظروں میں رسالت کا نور تھا۔ زمان و مکان کے پردے فاطمہ زہراؑ کی نگاہوں کے سامنے حائل نہیں ہو سکتے ـــــ تو اب فاطمہ دیکھ رہی تھیں کہ سرزمینِ عرب بے گناہوں کے خون سے رنگین ہو گی۔ فرات و دجلہ کا پانی زہرِ ہلاہل بن جائے گا۔ مدینہ تاراج ہوگا۔ صحنِ کعبہ میں گھوڑے باندھے جائیں گے۔ دشتِ کربلا آلِ محمدؐ کے خون میں نہائے گا۔ بغداد کی گلیاں آگ برسائیں گی۔ سادات کا خون گارا بنے گا۔ بیت المقدس یہودیوں کے قبضہ میں چلا جائے گا۔ ایران و عراق کی زمین پر انسانی خون کا سیلاب آئے گا۔ عدل و انصاف کے الفاظ صرف کتابوں میں رہ جائیں گے ـــــ دنیا میں ہونے والے لاکھوں یتیموں کی فریادیں فاطمہؑ کے کانوں سے ٹکرا رہی تھیں۔ ظہور تک ہونے والی بیواؤں کی سسکیاں فاطمہؑ سن رہی تھیں۔ صدیوں تک ظلم و ستم کے شکنجے میں جکڑی ہوئی انسانیت کی چیخیں فاطمہؑ سماعت فرما رہی تھیں۔ دنیا کے اربوں مستضعفین کی بیچارگی فاطمہؑ کا دل دہلا رہی تھی ـــــ فاطمہؑ رو رہی ہیں روئے جا رہی ہیں اپنے غم میں نہیں امت کے غم میں۔ کیوں نہ روتیں۔ فاطمہؑ اس باپ کی بیٹی تھیں جس نے امت کے لئے پیٹ پر پتھر باندھے تھے۔ اس باپ کی لختِ جگر تھیں جس نے زخم کھا کے امت کو دعائیں دی تھیں ـــــ آخر فاطمہؑ اس امت کی بربادی اور ہلاکت کیسے برداشت کر لیتیں جس کے لئے

فاقے کئے تھے۔ چکیاں پیسی تھیں جس کی فلاح کے لئے آبلے بھرے ہاتھوں سے دعائیں مانگتی تھیں ــــ اور اب امت کا بھیانک مستقبل فاطمہؑ کو تڑپا رہا ہے۔ مدینے کی خاموش فضاؤں کا سینہ چیرتی ہوئی دلخراش آواز گونج رہی ہے۔

"صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّھَا"

انسانیّت کا خواب

انسانیّت پھر ایک ایسے معاشرے کا خواب دیکھ رہی ہے جہاں نہ استعمار ہو نہ استحصال، نہ استکبار ہو نہ استضعاف، نہ کوئی بندہ ہو نہ بندہ نواز، نہ کوئی محمود ہو نہ ایاز — اگر چٹائیاں ہوں تو سب کے لئے، قالین ہوں تو سب کے گھروں میں، جھونپڑے ہوں تو سب کے پاس، شیش محل ہوں تو سب کے قبضۂ قدرت میں۔ نہ کوئی چھوٹا ہو نہ کوئی بڑا نہ کوئی غریب ہو نہ کوئی امیر۔

جہاں ذرائع پیداوار تک پہونچنے کے لئے ہر گھر سے راستہ جاتا ہو، جہاں ہر شخص کو اپنی صلاحیتوں کی نشوونما اور اسے بروئے کار لانے اور اس کی واقعی قیمت وصول کرنے کے مواقع برابر سے حاصل ہوں۔

جہاں کوئی اپنی چھوٹی یا جھوٹی صلاحیّت کی بڑی قیمت حاصل کر کے استعمار نہ کر سکے۔

جہاں کسی کی زیادہ اور سچی صلاحیتوں کو کم قیمت میں خرید کے ان کا استحصال نہ کیا جا سکے۔

جہاں انسانی محنت کی قیمت کا تعین منطقی بنیادوں پر ہوتا ہو۔ جوڑ توڑ، پینترے بازی کے ذریعے یا پانسہ پھینک کے نہ کیا جاتا ہو۔

جہاں کسی مروان کے بیٹے سونے کی سلوں کو کلہاڑیوں سے کاٹ کے نہ تقسیم کرتے ہوں۔

جہاں کسی ابوذر کی اولاد فاقوں میں دن نہ گذارتی ہو۔

جہاں تقسیمِ اموال کی بنیاد اعتباری فضیلتیں نہ ہوں بلکہ واقعی صلاحیتیں ہوں۔

جہاں پیداوار میں حصہ بٹانے کے لئے غیر منطقی پیمانے نہ ہوں۔

جہاں معاشرے کا سربراہ یہ اعلان کرتا ہو کہ صحابیت، سابقیت اور ہجرت جیسے کمالات کی قیمت علیؑ سے نہیں خدا سے ملے گی میرے پاس تقسیم کا پیمانہ انسانی ضرورت ہے۔

جہاں عثمان ابنِ حنیف اور ان کے غلام کو بیت المال سے ملنے والی تنخواہیں مقدار میں برابر ہوں۔

جہاں اسٹیج کے مسخرے چند لمحوں میں اتنا نہ کما سکیں کہ بچوں کو درس دینے والا معلم پورے مہینے کی جانفشانی کے بعد بھی نہ پا سکے۔

جہاں قسمتوں کا فیصلہ "جوئے خانوں" میں نہیں زندہ سچائیوں کی محفل میں ہوتا ہو۔

جہاں تقدیریں "شیئر مارکیٹ" میں نہیں میدانِ عمل میں بنتی ہوں۔

جہاں اقتصادی نابرابری اس منزل پر نہ پہونچ جائے جو انسانوں کو دیوانہ بنا دے۔

جہاں معاشی دوڑ میں آگے بڑھ جانے کا جذبہ اتنا شدید نہ ہو جائے کہ، ماؤں کی گودیوں سے بچوں کو چھین کر، آنکھیں پھوڑ دی جائیں، پاؤں کاٹ دیئے جائیں، اور اپاہج بنا کے بھیک منگوانے کی فیکٹری قائم کی جائے۔ اسپتالوں میں بے ہوش مریضوں کے اعضاء چرا کے بیچے جائیں۔ رشتوں کا تقدس نیلام کیا جائے۔ خون کی حرمت کا سودا ہو۔ جہاں کمسن بچوں کو منشیات کا عادی بنا کے زرکشی کی جائے۔

جہاں سماج میں ایسی ناہمواری نہ پیدا ہو جائے کہ اوپر "ایرکنڈیشن" کمرے میں ایک عیش پرست دادِ عیش دے رہا ہو اور نیچے ٹھنڈی یا گرم سڑک پر اللہ کا ایک لاوارث بندہ دم توڑ رہا ہو۔

جہاں معاشرہ قمار خانہ، نہ بن جائے کہ نہ کہا جا سکے کہ آنیوالی صبح کو کون لکھ پتی بن جائے گا اور کون فقیر ــــ؟ بلکہ جہاں ہر عمل کے یقینی نتیجے کا اعلان کیا جا سکے۔

جہاں کسی حادثے کے شکار کو یہ نہ کہنا پڑے ؎

یارانِ تیز گام نے منزل کو جا لیا

اب کیا کروں گا پاؤں سے کانٹے نکال کے

بلکہ قافلے کی نگرانی کرنیوالی طاقت ایک طرف کانٹا نکالنے میں اس غریب کی مدد بھی کرے اور دوسری طرف قافلے کو آگے بھی نہ بڑھنے دے کہ کانٹا نکالنے والا صدیوں پیچھے رہ جائے۔

ایک ایسے ہی معاشرے کا خواب جس کی صرف ایک جھلک تاریخ نے محمدؐ کے مدینہ میں دیکھی تھی، انسانیت اپنے سینے میں چھپائے ہوئے ہے۔ جس کی بنیاد پر نہ جانے کتنے ساحران الموت، برگ حشیش دے کے اور نہ جانے کتنے "کارل مارکس" اشتراکیت کی ڈگڈگی بجا کے انسان کو بیوقوف بناتے رہے ہیں۔

کیا انسانیت کا یہ خواب اب کبھی نہ پورا ہوگا؟ کیا انسانی لاشوں پر معاشی دوڑ اسی طرح ہمیشہ جاری رہے گی؟ کیا ظلم و جور کا یہ سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا؟

اگر انسانیّت کی یہ تمنّا کبھی پوری ہونیوالی نہیں تو پھر آخر فطرت اس خواب اور اس تمنّا کو ایک امانت کی طرح انسانی دلوں میں رکھ کے حفاظت کیوں کر رہی ہے؟

مگر یہ خواب کب پورا ہوگا؟ کیسے پایۂ تکمیل کو پہونچے گا؟

ہم اور صرف ہم پوری وضاحت یقین اور طمانیت کے ساتھ دنیا کے محرومین و مظلومین و مستضعفین کو خوشخبری دیتے ہیں کہ ایک دن اسلام دنیا کو استحصال و استعمار سے پاک کر کے عدل و انصاف سے بھر دیگا۔ یہ قرآن میں مالک کا اپنے بندوں سے کیا ہوا وعدہ ہے جو غلط نہیں ہو سکتا۔

اس وقت معاشرے کے ایک ایک ریشے میں ظلم گھسا ہوا ہے نہ علم محفوظ ہے نہ سیاست، نہ ادب محفوظ ہے نہ مذہب۔ مگر جب چاند کو دو ٹکڑے

کرنے والی انگلیاں اور درِ خیبر اکھاڑنے والے ہاتھ پردے سے باہر نکلیں گے تو سماج کو اس طرح نچوڑ دیں گے کہ ظلم کا ایک ایک قطرہ ٹپک کے بہہ جائے گا صرف اور صرف حق باقی رہے گا۔ مالک کے یہاں دیر ہو سکتی ہے اندھیر نہیں۔ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں تم بھی انتظار کرو۔

پیغمبرِ آخرؐ کا قائم کیا ہوا عدلِ اجتماعی پھر زندہ ہوگا۔ اور زندہ ہو کے پوری انسانیت کو اپنے دامن میں سمیٹ لے گا۔ عدل و انصاف کا ڈوبا ہوا سورج پھر نکلے گا۔

یہ دور اپنے براہیم کی تلاش میں ہے
صنم کدہ ہے جہاں لاَاِلٰہَ اِلاَّ اللہ
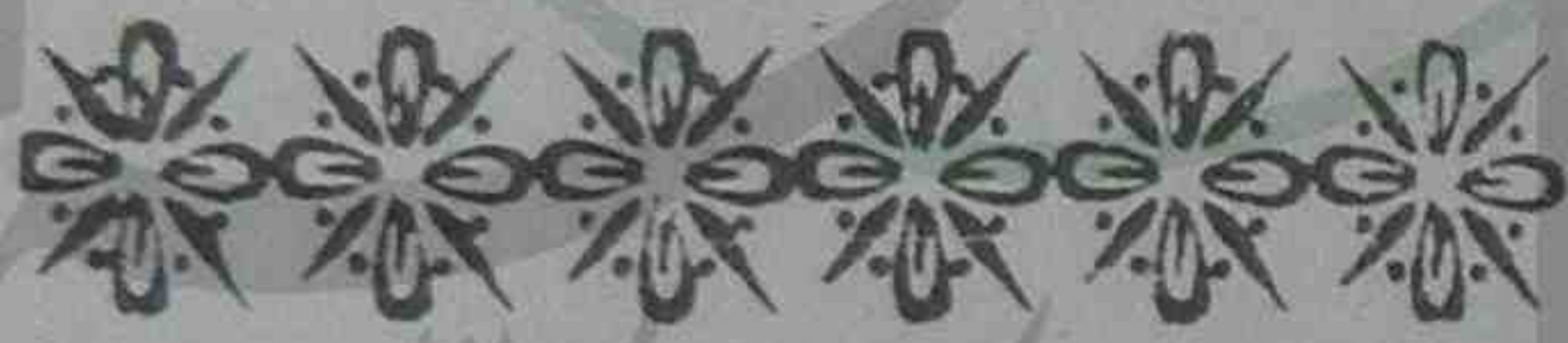
آخری انقلاب

زمانہ اپنے محمدؐ کا انتظار کر رہا ہے۔ بُت خانۂ ہستی اپنے ابراہیمؑ کی تلاش میں ہے۔ قلعۂ باطل اپنے خیبر شکن کا منتظر ہے۔

نام نہاد فلسفوں کے مداری تماشے دکھا کے رخصت ہو چکے ہیں۔ مذہب کو افیون بتانے والا انظام خود اپنے وطن کی زمین میں دفن ہو رہا ہے۔ ہیگل اور مارکس کے اقتصادی نظریات کا دم ٹوٹ چکا ہے، اشتراکیت کی سانس اکھڑ چکی ہے، شہنشاہیت کا جنازہ نکل چکا ہے۔ جمہوریت کی قباءِ اقتدار خود اس کا کفن بن رہی ہے۔ اشتمالیت کے نعرے صدا بہ صحرا ثابت ہو چکے ہیں۔ اہلِ سیاست بے دست و پا ہیں۔ اربابِ دانش محوِ حیرت ہیں۔ مغنّی کا نفس ہو کہ شاعر کی نوا، سب بے اثر ہیں۔ گرہ کشایانِ حیات نے اپنے ناخنوں کو زخمی کر لیا مگر عقدے کھلنے کے بجائے بڑھتے گئے۔ مشاطۂ علم کے شانے ٹوٹ گئے مگر زلفِ حیات کے پیچ و خم میں اضافہ ہی ہوتا رہا۔ مسئلوں کو سلجھانے کی ہر کوشش نے اسے اور الجھا دیا۔ فکر و نظر کے چراغ جلانے والے اپنا اپنا دامن جلا کے بیٹھ گئے مگر ظلم و ستم کے اندھیرے بڑھتے گئے۔

بزمِ حیات سے اخلاق و محبت، عدل و انصاف، اعتبار و اعتماد،

ایثار و قربانی، حق و صداقت، آئین و اصول ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے ہیں اور ان کی جگہ ظلم و جور، قتل و غارتگری، الزام و اتہام، خودغرضی و احسان فراموشی، دہشت گردی، جنسی بے راہ روی لیتی جا رہی ہے۔

اسلحوں کی دوڑ نے، منشیات کی ایجاد نے، استعمار و استحصال کی قوتوں نے انسانیّت کو ہلاکت کے اس دہانے پر پہونچا دیا ہے جہاں اگلا قدم اسکی ابدی ہلاکت کا سبب بننے والا ہے..... ایسا لگتا ہے کہ خاک و خون میں ڈوبی ہوئی انسانیّت آخری ہچکی لے کر ہمیشہ کے لئے خاموش ہو جانے والی ہے۔ مبصرین کہتے ہیں انسانی ترقی اپنے آخری سرے پر پہونچ چکی ہے۔ اب آگے کوئی راستہ نہیں.... حالات کہتے ہیں کہ دنیا کو اب تباہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ کہیں کوئی پناہ گاہ نہیں ہے۔ کوئی منزلِ نجات نہیں آنے والی ہے ـــــ مگر دل کہتا ہے نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا قدرت نے انسانیت کو اس لئے نہیں پیدا کیا ہے کہ وہ ہمیشہ ناکام و نامراد رہ کے ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے۔ عقل کہتی ہے کہ بزمِ ہستی اس لئے نہیں سجائی گئی ہے کہ دائمی ہلاکت کے اندھیروں میں گم ہو جائے۔ وجدان کہتا ہے کہ انسانیّت کی قسمت میں صرف تاریک ماضی ہی نہیں روشن مستقبل بھی ہے۔ انسانیت نے بُرے دن دیکھے ہیں تو اچھے دن بھی دیکھے گی ـــــ انسانی نفسیات کی گہرائیوں میں اتر کے دیکھئے ہر انسان انتظار کرتا ہوا دکھائی دے گا۔ ہر قوم نجات کا خواب دیکھ رہی ہے ـــــ ہر فرد ڈوبتے ہوئے جہاز کے مسافر کی طرح آس لگائے بیٹھا

ہے۔ یعنی فطرتِ انسانی کسی آنے والے کا اعلان کر رہی ہے۔ یعنی وہ آئے گا ضرور آئے گا۔

مگر وہ کون ہے؟ کہاں ہے؟ کب آئے گا؟

ان سوالوں کا مکمل جواب دنیا کی کسی قوم کے پاس نہیں ہے۔ مگر ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں عقل و منطق کی بلندیوں پر کھڑے ہو کے پوری وضاحت سے ہر سوال کا جواب دیتے ہیں۔

• مگر وہ اس بگڑے ہوئے ماحول کا پروردہ نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ جب آویں کا آواں ٹیڑھا ہو جائے تو اس کی اینٹوں سے سیدھی عمارت نہیں بن سکتی۔ شرک و بدعت سے آلودہ ہاتھ اس کی پرورش نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسے شرک و بدعت کے ہر چھوٹے بڑے دھبّوں کو مٹانا ہے۔ یہ ظلم و جور سے بھرا معاشرہ اسے عالمِ وجود میں نہیں لا سکتا اس لئے کہ تاریکیوں سے روشنی کا ظہور ناممکن ہے۔ لہٰذا بے اختیار ہماری نگاہیں اس مقدّس نسل کی طرف اٹھتی ہیں جس کی تشکیل حالات کے سہارے نہیں بلکہ وحیِ الٰہی کے گہوارے میں ہوئی ہے۔ اور ساری دنیا کی تاریخ مل کے بھی اس معصوم نسل کے خلاف چھوٹے سے چھوٹے انحراف، برائی اور خطا کا کوئی ثبوت ابتک نہیں پیش کر سکی ہے۔ اس لئے ہم کہتے ہیں کہ اس گھرانے کا آخری چراغ فانوسِ غیبت میں آج بھی روشن ہے۔ جب ہم جانتے ہیں کہ نسلِ محمدیؐ کا معصوم سلسلہ ۲۵۶ھ کے بعد آگے نہیں بڑھا اور پورے عالمِ وجود میں کوئی ایسی نسل نہیں

موجود ہے جو اس مطلوبہ انسان کو پیدا کر سکے جو ظلم و جور کو ختم کر کے دنیا کو عدل و انصاف سے بھر دے ــــ تو عقل یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہے سلسلۂ عصمت کی آخری کڑی فرزندِ زہراؑ اعسکریؑ کے لال کو اللہ نے زندہ رکھا ہے جو قرآن کے وعدوں کو پورا کرے گا (انشاء اللہ)۔

طولِ حیات پر گفتگو بچوں کی بحث ہے اس لئے کہ نہ قرآن اس سے انکار کر رہا ہے نہ حدیث نہ سائنس اس کے تصوّر کے خلاف ہے نہ عقل و منطق۔

• وہ اسی آسمان و زمین کے درمیان موجود ہے۔ اس کے گرد فاطمہؑ کی دعاؤں کا حصار ہے۔ اس کے دامن میں انبیاء کی آرزو کی امانت ہے۔ پہلو میں پیغمبر اسلامؐ کا دل ہے نگاہیں تاریخ کے نشیب و فراز کا مشاہدہ کر رہی ہیں۔

وہ تاریخ کی کتابیں پڑھ کر نتائج اخذ کرنے والا نہیں ہے کہ اندازے کی غلطی ہو جائے۔ بلکہ تقریباً گیارہ سو سال کا زمانہ اس کی آنکھوں کے سامنے گذر رہا ہے اور اس سے پہلے کی تاریخ کا عکس قرآن کے آئینے میں دیکھ رہا ہے۔ انگلیاں بیمار اور مریض انسانیت کی ڈوبتی ابھرتی نبضوں کو پرکھ رہی ہیں، ذوالفقار کا نشتر ہاتھوں میں ہے اور اس وقت کا انتظار کر رہا ہے جو آخری آپریشن کی کامیابی کے لئے ضروری ہے۔

• وہ اسی وقت آئے گا جو وقت اس کے ظہور کے لئے مناسب ترین وقت ہوگا نہ ایک لمحہ کی تعجیل ہو گی نہ ایک لمحہ کی تاخیر۔

جس طرح اللہ انسان پر اس کی طاقت سے زیادہ ذمہ داریاں نہیں

ڈالتا اسی طرح مختلف زمانوں میں وہی کام انجام پاتے ہیں جو اس کے لئے مناسب ہوں۔

سردی میں اگنے والے پودے گرمی میں نہیں اگائے جاسکتے اور اپنے موسم سے پہلے درخت میں پھل نہیں آسکتا۔ ٹھیک اسی طرح اللہ نے اپنے نمائندوں پر وہی فرائض عائد کئے جو اس زمانے میں قابلِ عمل تھے۔ اسی لئے قانونِ الٰہی کی بنیادوں پر عالمی حکومت قائم کرنے کی ذمہ داری نہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء پر ڈالی گئی نہ گیارہ معصومینؑ پر۔ یہ کام اس وقت ممکن ہی نہیں تھا۔ یہ کام نہ پیغمبرِ اسلامؐ کے زمانہ میں ہو سکتا تھا نہ علیِ مرتضیٰؑ نہ امام حسنؑ، نہ امام حسینؑ کے زمانے میں۔

مگر اب حالات عالمی حکومت کے لئے راہیں ہموار کر رہے ہیں۔ زمانۂ ظہور سے قریب ہوتا جارہا ہے اور گوشِ بصیرت کو آخری انقلاب کی آہٹ سنائی دے رہی ہے۔....

دنیا کو ہے اس مہدیِٔ برحق کی ضرورت
ہو جس کی نظر زلزلۂ عالمِ افکار

(علامہ اقبال)

ہمارے آئندہ نشریات

- [illegible]ام ہی کیوں؟ (دوسرا حصہ) پیامؔ اعظمی زیرِ طباعت
- [illegible]سر بہ گریباں ہے ابوالفیض 〃 〃
- افکار (فکر انگیز مقالات کا مجموعہ) پیامؔ اعظمی 〃 〃
- والعصر (مرثیوں کا دوسرا مجموعہ) پیامؔ اعظمی 〃 〃
- کربلا کیا ہے؟ حلقۂ تصنیف و تالیف زیرِ ترتیب
- ابوتراب 〃 〃 〃 〃

IMAMIA DARUL ISHA'AT
Ambari, Distt. Aazam Garh-223 222 U.P. (India)
Phone : 91-5460-40591
E-mail:apnaislam@rediffmail.com